جلد ۸۳ جنوری، فروری ۱۹۹۹ء شمارہ ۔۔ ۱، ۲

اس شمارے میں

ناشر: احمدیہ انجمن اشاعت اسلام (لاہور) یو ایس اے

پتہ: ۱۳۱۵ کنگز گیٹ روڈ، کولمبس، اوہائیو ۴۳۲۲۱-۱۵۰۴ (یو ایس اے)

www.aaiil.org

قرآن مجید کی روشنی میں

قرآن مجید کی آیت استخلاف اور سلسلہ مجددیت

"اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں زمین میں خلیفہ بنائے گا' جیسا انہیں خلیفہ بنایا جو ان سے پہلے تھے اور وہ ان کے لئے ان کے دین کو جو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے مضبوطی سے قائم کردے گا اور وہ ان کے لئے ان کے خوف کے بعد بدل کر امن (کی حالت) کردے گا وہ میری عبادت کریں گے' میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور جو کوئی اس کے بعد کفر کرے تو وہی نافرمان ہیں" (۵۵:۲۴)

لیستخلفنہم۔ خلف اور **خلیفة** کے لئے دیکھو نمبر ۴۵ اور خلافت دوسرے کی نیابت ہے اور **خلف فلان فلانا** کے معنی ہیں **قام بالامر عنه** یعنی دوسرے سے لیکر حکومت کا تعاہد کیا' خواہ اس کے ساتھ ہو یا اس کے بعد (غ) اور **استخلف فلان من فلان** کے معنی ہیں اسے اس کی جگہ قائم کیا اور **استخلفته** میں نے اسے اپنا خلیفہ یعنی جانشین بنایا اور **استخلفه** اسے خلیفہ بنایا اور **خلافة** امارت یا حکومت کو کہتے ہیں اور زجاج کا قول ہے کہ جائز ہے کہ اولیاء اللہ کو اللہ تعالیٰ کی زمین میں اس کے **خلیفے** کہا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے **یداود انا جعلنک خلیفة فی الارض** (ص ۲۶:۳۸) اور اوروں نے کہا' کہ **خلیفة سلطان المعظم** ہے اور **ھوالذی جعلکم خلائف فی الارض** (فاطر ۳۹:۳۵) میں فراء کا قول ہے کہ امت محمد صلعم کو کل امتوں کا جانشین بنایا اور **خلائف فی الارض** کے یہ معنی بھی کئے گئے ہیں کہ تم ایک دوسرے کے جانشین بنتے رہتے ہو اور بیٹے کو جب وہ اپنے باپ کی جگہ میں ہو کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے باپ کا خلیفہ ہوا (لسان العرب)

وعدۂ استخلاف اور حکومت اسلامی: اس آیت میں تین وعدے صراحت سے دیئے گئے ہیں۔ اول وعدۂ استخلاف' دوم تمکین دین' سوم خوف کی جگہ امن قائم کر دینا۔ وعدۂ استخلاف سے عموماً" مراد صرف حکومت اور بادشاہت کا ملنا لیا گیا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کی زبان سے بنی اسرائیل کو کہا گیا **عسیٰ ربکم ان یھلک عدو کم و یستخلفکم فی الارض** (الاعراف ۱۲۹:۷) اور اسی کی طرف **کما استخلف الذین من قبلھم** میں اشارہ ہے یعنی تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کردے گا اور تمہیں زمین میں بادشاہ بنا دے گا۔ چنانچہ ابن جریر میں ہے **لیورثنھم اللہ ارض المشرکین من العرب والعجم فیجعلھم ملوکا** یعنی اللہ انہیں مشرکین عرب و عجم کی سرزمین کا وارث کردے گا اور انہیں بادشاہ بنا دے گا۔ ایسے ہی اقوال سب تفاسیر میں ہیں کہ مراد اس سے یہ ہے کہ تمہیں ملک میں ایسا تصرف دے گا جو بادشاہوں کو دیا جاتا ہے اور کفار کو ہلاک کر کے ان کا جانشین انہیں بنا دے گا مگر **استخلاف** کا لفظ وسیع ہے اور یہاں کفار کے استخلاف کا ذکر نہیں۔ اور پھر یہاں ذکر امت کا ہے جو رسول سے الگ کر کے کیا گیا ہے کیونکہ اس آیت سے پہلے بھی اور بعد بھی اطاعت رسول کو فلاح اور فوز کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ تو پس یہاں مراد یہی ہے کہ امت محمدیہ کو آنحضرت صلعم کی خلافت دی جائے گی اور حضرت ابوبکر خلیفہ رسول اللہ ہی کہلائے اور آنحضرت صلعم سے امت کو خلافت ملنا خلافت کے دونوں معنوں کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی امارت یا حکومت بھی اور ولایت بھی جیسا کہ لفظ خلیفہ میں یہ دونوں مفہوم شامل ہیں۔ کیونکہ نیابت سے مراد ہے کہ جو کچھ رسول اللہ صلعم کو دیا گیا وہ آپؐ کی امت کو بھی دیا جائے گا اور آپؐ کو بادشاہت بھی دی گئی اور ہدایت اور ارشاد خلق کا کام بھی دیا گیا اور بنی اسرائیل کو جس کی طرف یہاں الفاظ **کما استخلف الذین من قبلھم** میں اشارہ کیا گیا ہے بادشاہت اور نبوت دونوں دیئے گئے **اذ جعل فیکم انبیاء و جعلکم ملوکا** (المائدة ۲۰:۵) بلکہ آنحضرت صلعم کی خلافت میں یہ بھی صاف مفہوم موجود ہے کہ وہ سلطنت جو آنحضرت صلعم کو دی گئی اور وہ جسمانی اور روحانی دونوں رنگوں پر

مشتمل تھی اسے دوام حاصل ہو گا یعنی بادشاہت اور ولایت مسلمانوں میں ہمیشہ رہے گی۔ کیونکہ امت کا وجود قیامت تک باقی ہے اور امت محمدیہ کی جگہ دوسری کوئی امت دنیا میں نہ لے گی۔ البتہ پہلے سلسلہ بنی اسرائیل میں خلافت میں نبوت بھی شامل تھی اس لئے کہ حضرت موسیٰؑ کی شریعت کامل نہ تھی بلکہ اپنے اپنے اوقات میں انبیائے بنی اسرائیل ہدایت و رشد اپنے اپنے زمانہ کے مطابق لاتے رہے اور ایسا ہی حضرت موسیٰؑ اپنی امت کے لئے کامل نمونہ نہ تھے بلکہ الگ الگ اخلاق کے الگ الگ نمونے ان میں ہوتے رہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حدیث نبویؐ ہے **کانت بنو اسرائیل تسوسہم الانبیاء کلما ھلک نبی خلفہ نبی وانہ لا نبی بعدی وسیکون خلفاء** یعنی بنی اسرائیل کی رہنمائی نبی کرتے تھے جب ایک نبی فوت ہو جاتا تو دوسرا اس کا جانشین ہو جاتا اور میرے بعد کوئی نبی نہیں اور خلفاء ہوں گے۔ پس وہاں بادشاہت اور نبوت تھی یہاں بادشاہت اور ولایت رہے گی کیونکہ بادشاہت کی ضرورت تو ہمیشہ ہے اور نبوت کو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم میں کامل کر کے اسکی جگہ ولایت کا سلسلہ جاری فرمایا۔ اگر نبوت آنحضرت صلعم کی ذات بابرکات میں کمال کو نہ پہنچتی تو اس امت میں بھی نبی ہوتے مگر جب نبی کی ضرورت باقی نہ رہی کیونکہ نور نبوت آنحضرت صلعم کی ذات میں کمال کو پہنچا ہوا۔ ہر وقت موجود ہے تو اس کی نیابت ولایت سے ہی ہو سکتی تھی۔

خلافت راشدہ: اس دوہری خلافت میں بعض وجود تو ایسے ہوئے کہ وہ دونوں امور یعنی سلطنت اور رشد و ہدایت کو جمع رکھتے تھے۔ جیسے خلفائے راشدین مہدیین یعنی خلفائے اربعہ جنہوں نے آنحضرت صلعم کے بعد جسمانی اور روحانی دونوں قسموں کی بادشاہت کو اپنے وجود میں جمع کیا کیونکہ یہ وہ پاک لوگ تھے جنہوں نے آنحضرت صلعم کے رنگ کو بکمال اپنے اندر لے لیا اور اس کے بعد عموماً" بادشاہت اور ولایت کا سلسلہ الگ الگ چلا۔ سوائے اس کے کہ کبھی کسی بادشاہ کو اللہ تعالیٰ نے تجدید دین کے لئے بھی کھڑا کر دیا ہو' جیسے حضرت عمر بن عبدالعزیز اور یہی معنی اس حدیث کے ہیں **الخلافۃ بعدی ثلاثون سنۃ ثم تکون ملکا عضوضا** یعنی خلافت میرے بعد تیس سال رہے گی پھر بادشاہت ہو گی' جس میں لوگوں پر ظلم بھی ہو گا۔ اور وہ بادشاہت چونکہ صرف ایک حصہ خلافت کا اپنے اندر رکھتی ہے اور اس میں بعض مکروہ امور بھی شامل ہو جاتے ہیں' اس لئے اسے خلافت سے الگ کر کے ذکر کیا اور اس بادشاہت والی خلافت میں ملک عرب کی بادشاہت تو امر لازم ہے اس لئے کہ وہ بادشاہت نبی کریم صلعم کو ملی' پس ضرور ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے مسلمانوں میں رہے اور احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دائرہ وسیع ہو گا' جیسا کہ حدیث **ان ربی زوی لی الارض** میں ہے دیکھو نمبر ۲۱۹۳- یہی وہ خلافت ہے جس کا مذہبی مسئلہ ہونا آج کئی مسلمانوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتا' غیر مسلم تو ایک طرف رہے۔ وہ بادشاہت جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کو عطا فرمائی اور جو دین اسلام کے قیام اور تمکین کے لئے اور اس کے بعض ارکان کی حفاظت کے لئے ضروری تھی غیر مسلموں کے ہاتھ میں نہیں جا سکتی۔ بلکہ ضروری ہے کہ آنحضرت صلعم کی بادشاہت جسمانی کے وارث بھی مسلمان ہی رہیں۔ اور غیر مسلم سلطنتوں کی اس کے خلاف کوشش اور ملک عرب پر تصرف کرنے کی تدابیر اسی غرض کے لئے ہیں کہ وعدۂ الٰہی کو باطل کریں مگر اللہ تعالیٰ کے وعدے غلط نہیں ہو سکتے اور اس وعدۂ الٰہی کے خلاف تمام منصوبے انجام کار نیست و نابود ہوں گے۔ ہاں اس وقت مسلمانوں کا بھی فرض ہے کہ جو ذرائع ان کے اختیار میں ہیں وہ ان ناپاک منصوبوں کے خلاف استعمال کریں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں نے خود ایمان فروشی کر کے ہی غیر قوموں کو یہ موقعہ دیا۔ اگر وہ ایمان کو ہاتھ سے نہ دیتے' تو کوئی غیر مسلم طاقت وہاں کسی قسم کا تصرف حاصل نہ کر سکتی تھی۔ تو فی الحقیقت ایمانی حالت کی کمزوری نے خلافت جسمانی کو بھی کمزور کیا ہے۔ اور اس کی وجہ مسلمانوں کا خود خلافت روحانی کے پہلو کو ترک کر دینا ہے یہاں تک کہ ان کے نزدیک ملک عضوض ہی سب کچھ ہے۔ اور یہ خیال کہ خلافت جسمانی صرف قریش میں ہونی چاہئے صحیح نہیں۔ اسلام سب قوموں کے لئے آیا جو قوم اپنے اعمال کے لحاظ سے زیادہ حقدار ہو گی وہی خلافت کی مالک ہو گی اور حدیث **الائمۃ من قریش** کی اصلیت دوسری حدیث سے معلوم ہوتی ہے جہاں آنحضرت صلعم نے بارہ ائمہ کا ذکر کر کے فرمایا **کلھم من قریش** یہ بارہ امام قریش میں سے ہوں گے اس سے یہ مراد نہ تھی کہ جب تک دنیا قائم ہے قریش سے خلفا ہوتے رہیں گے یہ خلاف واقعات ہے اور قرآن کریم نے صرف ایمان اور عمل صالح کی شرط رکھی ہے قومیت کی شرط نہیں رکھی اور قومیت کی شرط اصول اسلام کے خلاف ہے۔

خلافت روحانی اور بعثت مجددین: خلافت روحانی میں اگرچہ اصل ولایت ہی ہے مگر کسی شخص کے منہاج نبوت پر کھڑا کیا جانے کا ذکر بھی صحیح حدیث میں موجود ہے اور یہ حدیث ابو داؤد نے بیان کی ہے ان **اللّٰہ یبعث لھذہ الامة علی راس کل مائة سنة من یجدد لھا دینھا** یعنی اس امت کے لئے ہر صدی کے سر پر ایک مجدد مبعوث کرتا رہے گا۔ اور امام سیوطی کہتے ہیں **اتفق الحفاظ علی تصحیة** یعنی حدیث کے حافظ اس کی صحت پر اتفاق رکھتے ہیں۔ ہمارے زمانہ سے قریب حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ نے بھی اس حدیث کی صحت کو تسلیم کیا ہے۔ مجددین بالخصوص خلافت روحانی کی طرف لوگوں کی توجہ دلانے والے ہوتے ہیں۔ ہمارے اس زمانہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے جس مجدد کو چودھویں صدی کے سر پر کھڑا کیا ہے اس نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے اور مسلمانوں کی تمام بیماریوں کی اصل جڑ اسی بات کو قرار دیا ہے کہ وہ دین کی طرف سے غافل ہیں۔ اور تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کو ہی اصل علاج قرار دیا ہے۔

اس کے بعد دو وعدے ہیں ایک تمکین دین یعنی دین کا ایسا مضبوط کر دینا کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے برباد نہ کر سکے۔ اور دوسرے خوف کے بعد امن۔ اور ایک خوف تو وہ تھا جو زمانہ نبویؐ میں تھا یہاں تک کہ صحابہ نے نبی کریم صلعم سے شکایت کی کہ یا رسول اللہ ہمیں دن رات ہتھیار بند رہنا پڑتا ہے کیا کوئی ایسا وقت بھی آئے گا کہ ہم امن میں ہوں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے خوف کی جگہ امن کر دیا مگر یہ وعدہ استمراری ہے یعنی ہر حالت خوف کے بعد امن ہو جائے گا۔ اور اعدائے دین کا خوف مسلمانوں کو ہی رہے گا۔ یہ آیت اہل تشیع پر قطعی حجت ہے کہ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کی خلافت حق ہے اس لئے کہ قرآن کریم نے جو معیار خلافت کا قرار دیا تھا وہ کامل طور پر انہی دو خلافتوں میں پورا ہوا۔ یعنی تمکین دین اور تبدیل خوف بالامن

یعبدو ننی لایشرکون بی شیئا' **الذین امنوا** سے حال ہے یعنی یہ وعدہ ان کے ساتھ ہے جو میری عبادت کرتے ہیں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے اور یا استخلاف کی علت ہے یعنی چونکہ یہ لوگ میری عبادت کرتے ہیں اس لئے میں انہیں زمین میں بھی بادشاہ بناؤں گا اور یا اس میں بھی ایک پیشگوئی ہے کہ اس ملک عرب کے اندر میری ہی عبادت ہوگی اور شرک مٹ جائے گا۔

من کفر بعد ذلک میں لفظ بمقابلہ ایمان بھی ہو سکتا ہے اور بمقابلہ شکر بھی۔ اوپر چونکہ مسلمانوں پر نعمتوں کا ذکر ہے اس لئے مراد کفران نعمت ہی ہے یعنی اگر پھر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے خروج کریں تو پھر وہ فاسق ہیں اور ایسے عہد شکنوں کے ساتھ خدا کا وعدہ کیونکر قائم رہ سکتا ہے۔ سو ایسا ہی ہوا اور خلافت کی کمزوری یا اس کی بربادی مسلمانوں کی ناشکری کا ہی نتیجہ ہے گو غیر قوموں کی طرف سے ہی وہ وقوع میں آئی ہو۔ (بیان القرآن از حضرت مولانا محمد علی ص ص۹۷۵'۹۷۶)

بانی سلسلہ احمدیہ کا سلسلہ مجددیت کے متعلق واضح بیان

پہلا نشان: **قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ یبعث لھذا الامة علی راس کل مائة من یجدد لھا دینھا** (ابوداؤد) یعنی خدا ہر ایک صدی کے سر پر اس امت کیلئے ایک شخص مبعوث فرمائے گا جو اس کیلئے دین کو تازہ کرے گا۔ اور اب اس صدی کا چوبیسواں سال جاتا ہے اور ممکن نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ میں تخلف ہو۔ اگر کوئی کہے کہ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو بارہ صدیوں کے مجددوں کے نام بتلا دیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث علماء امت میں مسلم چلی آئی ہے۔ اب اگر میرے دعوے کے وقت اس حدیث کو وضعی بھی قرار دیا جائے تو ان مولوی صاحبوں سے یہ بھی بچ ہے۔ بعض اکابر محدثین نے اپنے اپنے زمانہ میں خود مجدد ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ بعض نے کسی دوسرے کو مجدد بنانے کی کوشش کی ہے۔ پس اگر یہ حدیث صحیح نہیں تو انہوں نے دیانت سے کام نہیں لیا۔ اور ہمارے لئے یہ ضروری نہیں کہ تمام مجددین کے نام ہمیں یاد ہوں۔ یہ علم محیط تو خاصہ خدا تعالیٰ کا ہے۔ ہمیں عالم الغیب

ہونے کا دعویٰ نہیں مگر اسی قدر جو خدا بتلا دے۔ ماسوا اس کے یہ امت ایک بڑے حصہ دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور خدا کی مصلحت کبھی کسی ملک میں مجدد پیدا کرتی ہے اور کبھی کسی ملک میں۔ پس خدا کے کاموں کا کون پورا علم رکھ سکتا ہے اور کون اس کے غیب پر احاطہ کر سکتا ہے۔ بھلا یہ تو بتلاؤ کہ حضرت آدم سے لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر ایک قوم میں نبی کتنے گزرے ہیں اگر تم یہ بتلا دو گے تو ہم مجدد بھی بتلا دیں گے۔ ظاہر ہے کہ عدم علم سے عدم شے لازم نہیں آتا۔ اور یہ بھی اہل سنت میں متفق علیہ امر ہے کہ آخری مجدد اس امت کا مسیح موعود ہے جو آخری زمانہ میں ظاہر ہو گا۔ اب تنقیح طلب یہ امر ہے کہ یہ آخری زمانہ ہے یا نہیں۔ یہود و نصاریٰ دونوں قومیں اس پر اتفاق رکھتی ہیں کہ یہ آخری زمانہ ہے۔ اگر چاہو تو پوچھ کر دیکھ لو مری پڑ رہی ہے زلزلے آ رہے ہیں۔ ہر ایک قسم کی خارق عادت تباہیاں شروع ہیں پھر کیا یہ آخری زمانہ نہیں؟ اور صلحاء اسلام نے بھی اس زمانہ کو آخری زمانہ قرار دیا ہے اور چودھویں صدی میں سے بھی تیئس سال گزر گئے ہیں۔ یہ قوی دلیل اس بات پر ہے کہ یہی وقت مسیح موعود کے ظہور کا وقت ہے اور میں ہی وہ ایک شخص ہوں جس نے اس صدی کے شروع ہونے سے پہلے دعویٰ کیا۔ اور میں ہی وہ ایک شخص ہوں جس کے دعوے پر پچیس برس گزر گئے اور اب تک زندہ موجود ہوں اور میں ہی وہ ایک ہوں جس نے عیسائیوں اور دوسری قوموں کو خدا کے نشانوں کے ساتھ ملزم کیا۔ پس جب تک میرے اس دعوے کے مقابل پر انہیں صفات کے ساتھ کوئی دوسرا مدعی پیش نہ کیا جائے تب تک میرا یہ دعویٰ ثابت ہے کہ وہ مسیح موجود جو آخری زمانہ کا مجدد ہے وہ میں ہی ہوں۔ زمانہ میں خدا نے نوبتیں رکھی ہیں۔ ایک وہ وقت تھا کہ خدا کے سچے مسیحؑ کو صلیب نے توڑا اور اس کو زخمی کیا تھا۔ اور آخری زمانہ میں یہ مقدر تھا کہ مسیح صلیب کو توڑے گا یعنی آسمانی نشانوں سے کفارہ کے عقیدہ کو دنیا سے اٹھا دے گا۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد۔ (حقیقت الوحی ص ص ۱۹۳، ۱۹۴)

باب دوم

ترجمہ: ممتاز احمد باجوہ ایم۔ اے، ایم ایڈ

نیا نظام عالم ۔ ۴

حضرت مولانا محمد علی مفسر قرآن انگریزی و اردو کی معروف کتاب "نیو ورلڈ آرڈر" کا اردو ترجمہ

معاشی مسئلہ

اسلام نے خدا پر پختہ ایمان اور یقین پیدا کر کے انسانی قلوب میں خدا کی معرفت کی جڑیں گہری کر دیں ہیں۔ اور اس طرح انسانیت کے مختلف طبقات میں ملاپ پیدا کرنے اور مختلف نسلوں اور قوموں کو ایک نسل اور ایک قوم بنا کر پر امن عالمی نظام کی پختہ اور یقینی بنیادیں رکھیں بلکہ اس نے اس نظام کی تمام ضروری تفصیلات بھی فراہم کی ہیں۔ صحت مند سماجی نظام اور مضبوط سیاسی تنظیم کے راہ نما اصول بھی مہیا کئے ہیں۔ یہ دو اہم بنیادیں ایک مضبوط اور دیرپا تہذیب کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔

معاشرتی نظام کے مسائل میں معاشی مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ جو ہر ذہن کو پریشان کئے رکھتا ہے۔ مغرب کی مادی تہذیب نے ایک طرف بین الاقوامی انسانی تعلقات میں افراتفری پیدا کر رکھی ہے۔ تو دوسری طرف اس نے ہر قوم میں طبقاتی جنگ برپا کر دی ہے۔ اس میں کچھ بنیادی نقائص ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی دنیا کا معاشرتی اور معاشی نظام نے نئے حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کی اہلیت نہ رکھنے کی وجہ سے دو مختلف انتہائی شکلیں اختیار کرلی ہیں۔ یا تو اس نے سرمایہ دار اور مزدور کی جنگ یا بورژوا اور پرلوتاری کی جنگ اور یا پھر مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ کی شکل اختیار کرلی ہے۔ یہ نہ ختم ہونے والی جنگ یورپ کے ہر ملک میں جاری ہے۔ جب اسلحے کے

زور پر تباہ کن جنگ ختم ہو جائے گی اور ظاہری طور پر دنیا میں امن قائم ہو جائے گا۔ تب بھی یہ نہ ختم ہونے والی جنگ یورپ کے ہر ملک میں جاری رہے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ جنگ سطحی طور پر ختم ہو گئی ہے لیکن اس نے قومی زندگی میں ایک اندرونی جنگ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ بلا شبہ تلوار تو نیام میں چلی گئی ہے لیکن موجودہ طبقاتی جنگ اور جنگ کی بین الاقوامی تباہ کاری، انسان کا انسان سے ظلم اور ناانصافی میں کوئی کمی نہیں آئی۔

معاشرتی میدان میں جنگ نے مغربی معاشرہ کو دو کیمپوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ زیادہ تر مغربی ممالک میں سرمایہ داری کو فوقیت حاصل ہے اور مزدور ظلم و ستم کا شکار ہے۔ لیکن روس دوسری انتہا کی طرف چلا گیا ہے۔ وہاں پرولتاری بورژوا طبقہ کے خلاف بے پناہ غصے میں بدلہ لے رہا ہے۔ معاملہ یہاں ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ مزدوروں کی ایک ملک میں کامیابی نے دوسرے ملک کے مزدوروں کو اس قسم کی کامیابیوں کی امید دلا دی ہے۔ ایک قوم کے اندر کی اس لڑائی نے اب عالمی جنگ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس جنگ میں روس نے تمام یورپ کے خلاف لوگوں کو صف آرا کر دیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جنگ عظیم کے بعد حالات نے نئے اتحاد کے لئے ان کو مجبور کر دیا ہے اور روس آج انگلستان اور امریکہ کا اتحادی ہے۔ لیکن جہاں تک طبقاتی جنگ کا تعلق ہے جو دنیا میں امن قائم ہونے کے بعد ضرور ضرور شروع ہو جائے گی۔ تو موجودہ اتحادی اپنے آپ کو ایک دوسرے کے بالمقابل دو مخالف کیمپوں میں پائیں گے۔

انگلستان اور امریکہ ایک طرف اور روس دوسری طرف ہے۔ ان کے درمیان حقیقی اتحاد دنیا میں نئے امن کی بنیاد بن سکتی ہے۔ جب تک ان ممالک کے معاشی نظریات میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو۔ اس وقت تک معاشی مسائل حل نہ ہوں گے اور نہ ہی صحیح معنوں میں امن قائم ہو سکتا ہے۔ ورنہ امن کی میز پر بیٹھ کر بھی یہ طاقتیں نئی جنگ کی تیاری کریں گی۔ اگر اس جنگ کو ہمیشہ جاری نہیں رہنا تو ایسے ذرائع اور وسائل تلاش کرنا ہوں گے جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے بر سرپیکار دونوں طبقوں میں کوئی افہام و تفہیم پیدا کر سکیں۔ نہ عیسائیت بحیثیت ایک مذہب کے اور نہ ہی مادی تہذیب جو اس کی پیداوار ہے اس قسم کا افہام و تفہیم پیدا کر سکتی ہے۔ اس معاملے میں امن کی تجاویز ایک مرتبہ پھر اسلام کے ذریعہ ہی منظر عام پر آسکتی ہیں اور یہ صرف اسلام کے قائم کردہ معاشرتی نظام کے ذریعہ ہی ممکن ہے جو سرمایہ دار اور مزدور کے مخالف مفادات میں درمیانی راہ دکھاتا ہے اور اس طرح مصالحت کی صورت پیدا کر کے دنیا میں حقیقی امن قائم ہو سکتا ہے۔

بہت سے یورپی مصنفین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اسلام یورپ کی معاشی نظریاتی جنگ میں درمیانی راہ دکھاتا ہے۔ گب "ودر اسلام" کے آخر میں یوں لکھتا ہے:

"مغربی دنیا میں اسلام اب بھی دوانتہاؤں کے درمیان توازن کی راہ قائم کرتا ہے۔ یہ یورپی قومیت کی مادر پدر آزادی اور اشتراکی روس کے سخت گیر نظام دونوں کے خلاف اس نے ابھی تک زندگی کے معاشی پہلو کو اپنے اوپر حاوی نہیں کیا۔ جس طرح یورپ اور روس نے آجکل کر رکھا ہے"۔ اس سلسلے میں مصنف پروفیسر میسیوں کا حوالہ دیتا ہے۔

"اسلام میں یہ خوبی ہے کہ اس میں ہر ایک شہری ایک منصفانہ نظام کے تحت عشر اور دیگر طریق پر رقوم فراہم کرنے میں حصہ لیتا ہے۔ یہ آزاد روپے کے تبادلے، بینک کے ذریعہ سرمایہ کاری، سرکاری قرضے اور ضروری اشیاء پر بالواسطہ ٹیکس کے سخت خلاف ہے۔ لیکن یہ باپ اور شوہر کو تجارت کے لئے نجی سرمایہ کاری اور ذاتی جائیداد کا حق دیتا ہے۔ اس معاملے میں بھی اسلام سرمایہ داری اور بالشوک اشتراکیت کے نظریات اور اصولوں کی درمیانی راہ اختیار کرتا ہے۔"
(صفحہ ۷۸۔۳۔۷۹)

اس لئے اسلام مغرب کی دو متحارب معاشی نظاموں کے درمیان امن قائم کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس کا معاشرتی نظام بعض ایسی خصوصیات کا حامل ہے کہ جو کسی دوسری جگہ دستیاب نہیں۔ پہلی بات یہ کہ اسلام زندگی کے معاشی پہلو کو انسانی ذہن پر حاوی ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ کہ وہ زندگی کی اعلیٰ اقدار کو بھول جائے کیونکہ مسلمان کا پہلا فرض خدا کے حقوق ادا کرنا ہے جو دیگر تمام فرائض پر مقدم ہے۔ وہ جو کام بھی کر رہا ہو اسے وہ چھوڑ دینا ہو گا جب اسے اپنے رب کے سامنے جھکنے کے لئے بلایا جائے۔ یہ آواز اسے صرف صبح سویرے ہی نہیں دی جاتی یا جب وہ سونے کے لئے جا رہا ہو۔ بلکہ انسان کے روزانہ کام کے دوران بھی اسے بلایا جاتا ہے۔ اس آواز کی تابعداری میں مسلمان یقیناً" خدا کی موجودگی کو محسوس کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اپنی روزی کے کمانے کے لئے اس کو اپنی پوری توجہ کام

کی طرف کرنی چاہئے لیکن وہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی جانتا ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد صرف روٹی کمانا ہی نہیں۔ زندگی کی اعلیٰ اقدار بھی ہیں جن کو معاشی اقدار کے ماتحت کرنا ہو گا۔ جب اس حقیقت کا احساس دل میں پیدا نہ ہو۔ قوموں اور افراد میں معاشی مقابلہ بالآخر ذہنی خوشی و مسرت کی بجائے یقیناً" غم و اندوہ اور تباہی لائے گا۔ مہذب قومیں معاشی فوائد کے حصول کی دوڑ میں اس سبق کو بھول گئی ہیں۔ اور اس طرح وہ ایک دوسرے کی تباہی کے لئے کام کر رہی ہیں۔

دوسرے اسلام کا معاشرتی نظام خدا کی مرضی کا مظہر ہے۔ اور کوئی انسانی نظام اس جیسی مضبوطی اور استحکام کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ ہر معاشرتی نظام اپنے نفاذ کے لئے کسی مادی قوت کا محتاج ہوتا ہے۔ لیکن اسلام کا معاشرتی نظام حکومتوں اور حاکموں کا محتاج نہیں۔ کیمونزم روس میں اس لئے موجود نہیں کہ وہ عوام کے ذہن کو اپیل کرتا ہے۔ بلکہ اس کی وجہ روسی حکومت کی قوت ہے جو اس کو نافذ کئے ہوئے ہے۔ فاشزم بھی اسی وقت قائم ہوتی ہے جب تک مادی قوت اس کی پشت پناہ پر ہوتی ہے۔ یورپ میں سرمایہ داری نظام اس وقت تک قائم ہے جب تک اس کے وسیع مالی وسائل اور نام نہاد جمہوری حکومتیں اس کی پشت پناہ ہیں۔ وہاں حقیقی طاقت عوام کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ ان بڑے بڑے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں ہے۔ جو خواہ یہودی ہوں یا غیر یہودی۔ لیکن اسلامی معاشرتی نظام میں ایسا نہیں ہے۔ اس کی بنیاد مذہب پر ہے جو انسانی ذہن کو اپیل کرتا ہے۔ وہ سیاسی یا مسلمہ قوت کا محتاج نہیں۔ مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں خواہ ان کی حکومت ہو یا رعایا ہوں وہ اصولوں کے تحت زندگی گزارتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ حقیقت ہے کہ اسلام کے معاشرتی نظام کی جڑیں لوگوں کے ذہنوں میں ہیں۔ ان کو نافذ کرنے کے لئے کسی مادی قوت کی ضرورت نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ اسلام کا معاشرتی نظام ہی ایک ایسا نظام ہے جس نے بطور ایک عالمی نظام کے اپنی افادیت کو تیرہ صدیوں میں قائم رکھا ہے۔ مشرق بعید سے لیکر مغرب بعید تک تمام نسلی' لونی اور لسانی اختلافات کے باوجود تمام دنیا میں مسلمان قوموں کے معاشرتی تصورات ایک ہی رہے ہیں لیکن یہ حقیقت تعجب خیز ہے کہ گذشتہ ہزار سال میں متعدد قوموں کے معاشرتی نظریات میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں۔ لیکن مسلمان اقوام کی حیثیت میں عروج و زوال کے باوجود اسلام کے معاشرتی نظام میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یہ اس بات کا بخوبی مظہر ہے کہ اسلام کے معاشرتی نظام میں ایسی قدرتی طاقت پنہاں ہے جو دنیاوی تبدیلیوں اور نشیب و فراز کے باوجود اس کے ماننے والوں پر اس بارے میں کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہوئے۔ یہ نہ صرف ایک عالمی نظام ہے بلکہ صرف یہی ایک مستحکم عالمی نظام ہے۔

اسلام کے معاشرتی نظام کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اسکا مقصد جہاں تک ممکن ہو سکے قوم کے تمام افراد کے لئے مساوات کا حصول ہے۔ یعنی ادنیٰ کو اعلیٰ کے برابر کھڑا کرنا۔ اور غریب کو خوشحال کرنا۔ اس معاملہ میں یہ بالشوزم سے نمایاں طور پر مختلف ہے۔ جو امیر کو غریب بنا کر اور اعلیٰ درجہ کو ادنیٰ کے برابر لانا چاہتا ہے۔ حضرت نبی کریمؐ کے مشن کے متعلق ابتدائی زمانے کی قرآنی وحی پر سرسری نظر ڈالنے سے صاف دکھائی دیتا ہے کہ اسلام نہ صرف مجبور و بے کس انسانیت کو آزاد کرانے اور غریب کی مدد کرنے کو آیا ہے بلکہ غریب کو اعلیٰ مقام پر لے جانے کے لئے آیا ہے جہاں وہ دولت مندوں کے ساتھ برابری حاصل کر سکے۔

اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس نے امیر اور غریب کے ذہنوں میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی ہے کہ سونے چاندی کے ڈھیر حاصل کرنے سے انسان کی عزت نہیں بڑھتی۔ اور نہ ہی غربت کی وجہ سے انسان ذلیل ہوتا ہے۔ ظاہری حیثیت کی بدلتی ہوئی شکل و صورت کوئی وقعت نہیں رکھتی اور جو خدا پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک بھی اس کی کوئی وقعت نہیں۔ اس سلسلہ میں چند حوالہ جات درج ذیل کئے جاتے ہیں:۔

"انسان کی حالت یہ ہے کہ جب اسے اس کا رب آزماتا ہے پھر اسے عزت دیتا ہے اور نعمت بخشتا ہے۔ تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے معزز کیا ہے۔ اور جب اسے آزماتا ہے پھر اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا ہے" (۸۹-۱۶-۱۵)

"اور اگر یہ نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی گروہ ہو جائیں گے تو ہم ان کے لئے جو رحمٰن کا انکار کرتے ہیں ان کی گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور سیڑھیاں بھی جن پر وہ چڑھتے ہیں اور ان کے گھروں کے دروازے اور تخت جن پر تکیہ لگاتے ہیں اور سونے کے (بھی) یہ صرف دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور آخرت تیرے رب کے نزدیک متقیوں کے لئے ہے" (۴۳/۳۵-۳۳)

سب سے پہلی بات جو اسلام ایک نیا معاشرتی نظام متعارف کرواتے ہوئے بتانا چاہتا ہے یہ ہے کہ دولت مندی یا دولت کے حصول کو اس کے صحیح تناظر میں انسانی ذہن میں بٹھایا جائے۔ یہ دھتکار دینے والی چیز نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ ہی اس عطیہ کا دینے والا ہے۔ (۲/ ۲۰۱) اس نے سامان آرائش و سجاوٹ اور اچھے انعامات کو جو وہ اپنے بندوں کو عطا کرتا ہے حرام نہیں ٹھہرایا۔ (۷/۳۲)۔ دولت کو واضح طور پر سہارے کا ذریعہ بیان کیا گیا ہے جو نادانوں کے ہاتھوں میں نہیں جانا چاہئے بلکہ اس کے منافع سے ایسے لوگوں کی دیکھ بھال کی جائے۔ (۴/۵) لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک تنبیہہ بھی ہے کہ یہ بذات خود مقصد نہیں بلکہ حصول مقصد کا ذریعہ ہے۔ دولت سے بلند تر زندگی کی اقدار ہیں اور یہ اقدار دولت کے حصول کی دوڑ میں نظر انداز نہیں ہونی چاہئے۔ تیرے رب کی رحمت اس سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ (۴۳/۳۲) اس لئے انسان کے دل میں دولت کو نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کو سب سے اونچا مقام دینا چاہئے۔

معاشرتی نظام کے متعلق خدائی سکیم جو اس نے اپنے بندے پر نازل کی اس کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ قدرت کے نظام میں تنوع ہے۔ وحدت کے باوجود اس میں اختلاف ہے۔ کوئی دو آدمی ایک جیسے نہیں اور نہ ہی ان کے دماغ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ انسانوں کے کام کرنے کی صلاحیت میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اور نہ ہی ہر ایک کو یکساں مواقع کام کرنے کے لئے میسر ہوتے ہیں۔ بعض کے دماغ دوسروں سے بہتر ہوتے ہیں۔ یا زیادہ کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور بعض کو بہتر حالات میسر ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کا کام بہتر نتائج لاتا ہے۔ ان اختلافات کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ان کو زندگی کا جزو سمجھ کر قبول کرنا چاہئے۔

"ہم نے ان کے درمیان ان کی دنیا کی زندگی میں ان کی روزی تقسیم کی ہے۔ اور ایک کے دوسرے پر درجے بلند کئے ہیں تاکہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے۔ (۴۳/۳۲)

"اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر روزی میں فضیلت دی ہے (۱۶/۷۱) کوئی ایسے ذرائع نہیں کہ ان اختلافات کو مٹایا جاسکے۔ حتیٰ کہ بالشوک روس بھی ان کو مٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ سٹالن اور ایک چھوٹا کاشتکار یا کان کن مزدور برابر نہیں ہو سکتے۔ اگر کچھ لوگ دوسروں کے ماتحت کام نہ کریں۔ تو یہ دنیا چل ہی نہیں سکتی۔ اگر یہ اختلافات نہ ہوں تو کوئی ریاست یا تنظیم قائم نہیں رہ سکتی۔ تمام کاروبار درہم برہم ہو جائیں گے۔ ذہنی اختلاف اور کام کرنے کی صلاحیتوں میں اختلاف کو معاشرتی نظام میں بھی تسلیم کیا گیا ہے حالانکہ اس نظام کی بنیاد ہی اس معروضے پر قائم ہوئی کہ مکمل مساوات ہونی چاہئے اور یہ کہ ریاست کو دولت کی مساوی تقسیم رائج کرنی چاہئے۔ امیروں سے ان کی دولت چھین کر ان پر ظلم و ستم کیا جائے جس طرح بعض ریاستوں میں غریبوں پر ظلم و زیادتی ہوتی ہے۔ لیکن یہ اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔

اسلام کے معاشرتی نظام کا مطمع نظر یہ ہے کہ دولت کی تقسیم منصفانہ اور مناسب طریق سے ہو۔ اس کے لئے اس نے ایک منفرد نظام وضع کیا ہے۔ سرمایہ داری کو تباہ کرنے کے لئے امیروں سے طاقت کے زور پر دولت چھیننا اور اس کو نظام ریاست یا قوم کی ملکیت قرار دینا ایک بہت بڑی ناانصافی ہے اور یہ اسلام کی روح کے بالکل منافی ہے۔ اس نے لازمی خیرات (زکواۃ) کا نظام رائج کیا ہے۔ لازمی ان معنوں میں نہیں کہ اس کے جمع کرنے کے لئے طاقت استعمال کی جائے بلکہ اس کو اخلاقی طور پر لازمی قرار دیا ہے۔ انفرادی ذہن کو تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جو کچھ انسان کماتا ہے اس کی محنت کا ثمر ہے۔ اس پر اس کے حق سے انکار نہیں کیا گیا۔ لیکن جب اس نے اپنی ضروریات زندگی پر جو کچھ خرچ کرنا تھا۔ خرچ کر دیا اور کچھ رقم بچالی۔ اس بچت کو سرمایہ قرار دیا گیا اور اس بچی ہوئی رقم میں سے ایک مقرر شدہ رقم اپنے سے کمزور بھائیوں کی بہبود کے لئے ریاست کے حوالے کر دے۔ یہ ایسا حصہ ہے جو امیروں کو غریب بنائے بغیر غریبوں کے فائدے کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ یہ خدا کا حکم تھا اور انسان کو خدا کی رضا کے سامنے سر تسلیم خم کرنا چاہئے۔

دولت جمع کرنے کے متعلق یہ خیال پایا جاتا ہے کہ اس میں برائی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے انسان کے دل میں دولت کی ناجائز محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس برائی کو ہر سال چالیسواں حصہ غربا کے فائدے کے لئے مخصوص کر کے دور کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے اس کو زکواۃ یا پاک کرنے کا عمل کہا گیا ہے۔ اگر ریاست مسلمان ہے تو اس کو حق پہنچتا ہے کہ انسان کی بچت میں سے مقررہ رقم کو اکٹھا کرے اور ان لوگوں میں تقسیم کر دے جن کو مدد کی ضرورت ہے۔ اگر ریاست مسلمان نہیں تو بھی مسلم قوم کو ایسی تنظیم تشکیل دینی چاہئے

جو زکواۃ کو اکٹھا کر کے غریبوں میں تقسیم کر سکے۔

انسان کا اپنا ایمان کہ دولت کا جمع کرنا ایک ناپاک عمل ہے اور ۲/۱۔۲ فی صد کی ادائیگی کے ذریعہ سے ہی اس کو پاک کیا جاسکتا ہے۔ اس ادائیگی کے لئے آمادگی نے ماضی میں اور آج بھی موثر کردار ادا کیا ہے۔ صرف یہی ایک طریق ہے جس کے ذریعہ اسلام نے جمع شدہ دولت کو تقسیم کیا۔ دنیا میں ایسا کوئی نظام نہیں جس میں اس قسم کا قدم اٹھایا جاتا ہو۔

انسانیت کو درپیش سب سے بڑا مسئلہ دولت کی تقسیم کا معاملہ ہے جس کے ساتھ سیاسی طاقت کا گہرا تعلق ہے۔ سرمایہ داری نظام جو کہ مغرب کی مادی تہذیب کا بنیادی پتھر ہے اس کے ذریعے دولت چند ہاتھوں میں مرکز ہو جاتی ہے۔ عوام غریب سے غریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ دولت جمع کرنے کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے۔ اور سرمایہ داروں کی مرضی کے مطابق سیاستدان امن یا جنگ کا اعلان کرتے ہیں۔ چونکہ سیاست مکمل طور پر سرمایہ داروں کے قبضہ قدرت میں ہوتی ہے اس لئے ان کی نہ ختم ہونے والی دولت کی ہوس نے دنیا کی قوموں کو غلامی میں دھکیل دیا ہے۔ اور نو آبادیات' مقبوضہ جات' بین الاقوامی نگرانی اور حلقہ اثر وغیرہ جیسے دلکش الفاظ اور محاورات کے ذریعہ لوٹ مار کو قانونی تحفظ دیا جاتا ہے۔ بڑی طاقتیں قومی سطح پر بڑے بڑے سرمایہ دار ہیں۔ جو سرمایہ داری کے ذریعہ دوسری قوموں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے بڑے بڑے قرضے دے کر مدد کرتے ہیں۔ اسلام سود کو حرام قرار دے کر اس برائی کا سدباب کرتا ہے۔ تاہم اس کا تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا۔

سرمایہ داری کے خلاف ردعمل تقریباً" ایک سو سال پہلے انیسویں صدی کے وسط میں شروع ہوا۔ یہ ردعمل سوشلزم کے نام سے شروع ہوا جو آہستہ آہستہ ترقی کرتا ہوا بالشوزم کا نام اختیار کرگیا۔ اس نے روس کو اپنی گرفت میں اتنی سختی کے ساتھ لیا جتنا کہ سرمایہ داری نے باقی یورپی ملکوں کو لیا ہوا تھا۔ روس کے باہر اس کا اثر بہت کم ہوا ہے۔ اگرچہ روس اس کی حمایت میں زبردست پراپیگنڈہ جاری رکھے ہوئے ہے کہ روس میں یہ قائم رہے گا۔ یہ ایک سوال ہے جس کا فیصلہ مستقبل ہی دے سکتا ہے لیکن ایک چیز جو ہر ایک کو بہت عجیب لگتی ہے یہ ہے کہ بالشوزم نے جو لوگوں کو آزاد کرانے کے لئے آیا تھا سرمایہ داری کی طرح سخت غلامی کی شکل اختیار کرلی ہے۔ زار کی آمریت کی جگہ روسی آمریت نے لے لی ہے۔

ہمارے پیش نظر یہ سوال ہے کہ کیا بالشوزم نے صنعت کو قومیا کر دولت کی تقسیم کے مسئلہ کو صحیح طور پر حل کرلیا ہے۔ یہ کہنا کہ چونکہ روس کے پہلے پانچ سالہ منصوبے نے پیداوار کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ جس کا تصور بھی نہ کیا جاسکتا تھا۔ اس لئے صنعتوں کی قومی ملکیت ہی مسئلہ کا صحیح حل ہے۔ یہ نتیجہ نکالنا بھی جلد بازی کے مترادف ہوگا۔ کون جانتا ہے کہ حکومتی ایجنٹ جن کو یہ کام کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے کل کو خود مطلق العنان ہو جائیں۔ جس طرح سرمایہ دار طبقہ حکمران اور مطلق العنان ہوتے ہیں۔ انسانی فطرت اس قسم کے رجحانات کی طرف جلد راغب ہو جاتی ہے۔ اور بالشوزم کے پاس اس برے رجحان کو روکنے کا کوئی موثر ذریعہ نہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے کہ بالشوزم مزدوروں کا دوست بن کر آیا ہے لیکن اس نے مزدوروں کو ان کی محنت کے ثمرہ سے محروم رکھا۔ ہر ایک کو ایک جیسی ضروریات زندگی مہیا کرنے کے اصول پر سختی سے عمل کرنے سے خواہ وہ نکما ہو یا محنتی' احمق ہو یا ذہین اس طریق سے ایسی صورت حالات پیدا ہو جائیں گی جو ناقابل برداشت ہو جائے گی۔ یہ طریق بلاواسطہ فطرت کے خلاف ہے اور قانون فطرت اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے برے نتائج ایک دن میں تو ظاہر نہیں ہوں گے سرمایہ داری کے بدنتائج ظاہر ہونے میں صدیاں لگ گئی ہیں۔ بالشوزم کی برائیاں ظاہر ہونے میں میں بھی لمبا عرصہ لگے گا۔

یہ سہرا صرف اسلام کے سر ہے کہ وہ نہ صرف دولت کی تقسیم کا مسئلہ حل کرتا ہے بلکہ اس کے ساتھ اعلیٰ جذبات کی نشوونما اور کردار سازی بھی کرتا ہے۔ صرف اسی پر ہی نسل انسانی کی ایسی تہذیب کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے جو دیرپا ہوگی۔ بالشوزم کے سخت قوانین صرف جسم کا خیال رکھتے ہیں۔ جو اس کو صرف اتنا دیتا ہے کہ وہ مناسب طریق پر زندگی کو برقرار رکھ سکے۔ لیکن اس طریق پر محبت اور ہمدردی کے اعلیٰ جذبات ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ صفات ہیں جو زندگی کو خوشگوار بنا دیتی ہیں۔ لیکن جن کی کمی انسان میں انتہائی وحشی پن اور بربریت کو پیدا کردیتی ہے۔ یہ دونوں مقاصد اسلام زکوٰۃ کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔ زکوٰۃ نہ صرف لوگوں میں مساوات پیدا کرتا ہے۔ بلکہ یہ انسان میں ایک دوسرے کے لئے محبت اور ہمدردی کے اعلیٰ جذبات کو نشوونما بھی دیتا ہے۔ جب کہ ریاستی ملکیت کا سخت نظام

انسان کے بلند جبلی احساسات کو ختم کر دیتا ہے۔ اس طرح زکوٰۃ کے ذریعہ دولت کو اسلام کے پورے نظام میں جاری و ساری رکھا گیا ہے۔ جس طرح کہ خون کو سارے جسم میں جاری رکھا جاتا ہے۔ امیروں کی دولت کا مقررہ حصہ مرکز یعنی بیت المال میں جمع ہو جاتا ہے جہاں سے معاشرہ کے ان طبقوں کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ جن کو اس کی سخت ضروری ہوتی ہے۔ زکوٰۃ کا نظام نہ صرف دولت کی مناسب تقسیم میں مدد دیتا ہے بلکہ اس کے ذریعہ قوم من حیث القوم ترقی کرتی ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ زکوٰۃ صرف لازمی خیرات ہی نہیں بلکہ یہ ایک ریاستی ادارہ ہے اور جہاں ریاست مسلمان نہ ہو وہاں ایک قومی ادارہ ہے۔ فرد کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ زکوٰۃ کو جمع کرے اور جس طرح چاہے خرچ کرتا رہے بلکہ اسے ریاست یا قومی تنظیم کو جمع کرنا چاہئے۔ پھر قوم پر اس کو خرچ کرنا چاہئے۔ زکوٰۃ دینے والے کو اپنی بچت کا کچھ حصہ بطور خیرات مستحق افراد کو دینے کا حق نہیں ہے۔ بلکہ اس کو اس فنڈ میں جمع کرانا چاہئے جو قومی بہبود کے لئے استعمال ہو۔

مصنف: ڈاکٹر زاہد عزیز (ایڈیٹر لائٹ)

اسلام کا تعارف-۱

بچوں اور ابتدائی مطالعہ کرنے والوں کے لئے ۱۰۰ سے زیادہ بنیادی سوالات کے جواب

(احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور اسلامی تعلیمات کے فروغ و اشاعت کیلئے ۱۹۱۴ء میں لاہور میں قائم ہوئی۔ حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام' کے ممتاز پیروکاروں نے اس کی بنیاد رکھی۔ اس انجمن نے اسلام کی وسعت خیالی' بردباری اور پرامن تعلیمات کو دنیا میں اور خاص طور پر مغربی دنیا میں موثر طریق پر پھیلایا۔ قرآن کریم اور حضرت نبی کریمؐ کے اسوہ حسنہ پر بلند پایہ اور بڑی مقدار میں لٹریچر مختلف زبانوں میں پیدا کیا ہے۔ اس کی مختلف ممالک میں شاخیں اور ممبران ہیں۔

انہی مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ محسوس کیا گیا اور اس بات کی بہت ضرورت اور مانگ بھی تھی کہ نوجوانوں میں اسلام کی تعلیمات کا تعارف کرانے کی غرض سے انگریزی میں ایک چھوٹی سی کتاب عام اور سادہ زبان میں پیش کی جائے۔ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے گزشتہ چند دہائیوں میں سلسلہ وار شاندار لٹریچر پیدا کیا ہے جو اسلام کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس کا خاص مقصد اسلام کے متعلق عام غلط فہمیوں کو دور کرنا اور ان شکوک و شبہات اور سوالات کا جواب دینا تھا۔ جو مذہب کے متعلق جدید دور کے ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس لٹریچر کو علمی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اس لئے کہ اس نے وقت کی ضرورت کو پورا کیا کیونکہ اس کے ذریعہ نہ صرف دین اسلام کی تعلیمات کو مستحکم رنگ میں سیکھنے کا موقع ملا بلکہ دنیا میں تبلیغ اسلام کے کام میں اس سے مدد ملی۔ چنانچہ وہ شاندار دینی علم جو تحریک احمدیت لاہور کی شائع کردہ کتب میں موجود ہے۔ اس کو نوجوانوں کے لئے عام اور سادہ زبان میں سمجھنے سمجھانے کی غرض سے یہ کتابچہ تیار کیا گیا ہے۔ اس کتابچہ کو لکھتے وقت ذہن میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ قاری کو دین اسلام اور اس کی اخلاقی تعلیمات کے متعلق کچھ بھی علم نہیں۔ بعض وقت مسلمان طلباء کو اسلام کی ابتدائی تعلیمات کی حقیقت سے پوری طرح آگاہی نہیں ہوتی ان کے لئے بھی یہ کتابچہ مفید رہے گا۔ اس میں اسلام کے تمام بنیادی اصول و ضوابط اور تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے۔ قرآن و حدیث کے متعلق معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں۔ سوال و جواب کے طرز کو اپنایا گیا ہے۔ اور امید ہے یہ انداز زیادہ تفصیلات فراہم کرنے کی نسبت زیادہ مفید رہے گا۔ میں نے زبان اور الفاظ کو سادہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ مقصد کس حد تک پورا ہوا ہے اس کا فیصلہ نوجوان قارئین ہی کر سکیں گے۔ بحرحال میں نے پوری کوشش کی ہے کہ یہ کتابچہ اسلام کو پڑھنے اور سمجھنے میں زیادہ سے زیادہ معاون ثابت ہو۔

پوری کتاب میں قرآن کریم کے براہ راست اقتباسات مکمل حوالوں کے ساتھ درج کئے گئے ہیں۔ بعض جگہوں پر اسلامی تعلیمات کو عام فہم لفظوں میں بغیر اقتباس اور حوالوں کے بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے تعارفی کتابچے میں اس کو ضروری نہیں سمجھا گیا۔

کسی مسئلہ کے بارے میں مزید معلومات یا زیادہ وضاحت کے لئے حضرت مولانا محمد علی صاحب کی کتب کا مطالعہ کرنا چاہئے جس کی فہرست اس کتابچے میں دوسری جگہ درج کی گئی ہے۔ بہرحال جب نوجوان قاری اپنے علم میں آگے بڑھیں گے تو یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان کتب سے استفادہ بھی کریں گے۔

چونکہ یہ کتابچہ اس قسم کی میری پہلی کوشش ہے اس لئے اس کو زیادہ بہتر انداز میں پیش کرنے کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ میں نہایت شکرگزار ہوں گا اگر قاری اس کتابچے کو زیادہ بہتر بنانے کے متعلق تجاویز اور مشورے ارسال کریں۔ میں اس قسم کی تمام تجاویز اور تبصروں کا خیرمقدم کروں گا۔

زاہد عزیز
ناٹنگھم (انگلستان)
اگست ۱۹۹۳ء

یقیناً "دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے (۱۹:۳)

۱۔ ہمارے دین کا نام کیا ہے؟

ہمارے دین کا نام اسلام ہے۔ اسلام کو ماننے اور اس کی پیروی کرنے والا مسلمان کہلاتا ہے۔

۲۔ اس لفظ کے معنی کیا ہیں؟

اسلام کے معنے "امن میں داخل ہونا" اور خدا کے حکموں کے سامنے سر جھکانا اور ان پر چلنا ہے اس لئے مسلمان کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو اللہ کے حکموں پر چلتے ہوئے اللہ اور اس کے بندوں کے ساتھ امن اور صلح کے ساتھ رہتا ہے۔

۳۔ اس مذہب کو یہ نام کس نے دیا؟

یہ نام قرآن کریم میں موجود ہے۔ جو مسلمانوں کی مقدس کتاب ہے۔ مثلاً" قرآن کریم فرماتا ہے :۔

"اے انسانو! میں نے تمہارے لئے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کیا ہے" (۳:۵)

اور "خدا نے تمہارا نام "مسلمان" رکھا ہے"۔ (۷۸:۲۲)

۴۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات کیا ہیں؟

خدا تعالیٰ سے صلح کرنا۔ یعنی اس کی فرمانبرداری اور رضا پر عمل کرنا۔ اور انسانوں سے بھی صلح کرنا یعنی اپنے اردگرد کے لوگوں کا بھلا سوچنا اور ان سے بھلائی کرنا۔ یہ بنیادی تعلیم قرآن شریف میں یوں بیان کی گئی ہے۔ "جو کوئی اپنے آپ کو اللہ کا فرماں بردار بنائے اور (دوسروں) کے ساتھ احسان کرنے والا ہے تو اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے"۔ (۱۱۲:۲)

(نوٹ :۔ قرآن کریم میں لفظ "وہ" جہاں کہیں استعمال ہوا ہے اس سے مراد ہر انسان ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت)۔

۵۔ اسلام دنیا میں کیسے آیا؟

دین اسلام کی تعلیمات اپنی موجودہ صورت میں حضرت محمد ﷺ پیغمبر خدا کے ذریعہ ہم تک پہنچی۔ آپ صلعم ۱۴۰۰ سال پہلے ملک عرب میں پیدا ہوئے اور دین اسلام کی تبلیغ کی۔ رسول اللہ صلعم (۵۷۴ء میں پیدا ہوئے اور ۶۳۲ء میں وفات پائی) تاہم حضرت نبی کریمؐ نے فرمایا کہ وہ دنیا میں کوئی نیا مذہب نہیں لائے کیونکہ اسلام کے بنیادی اصول وہی ہیں جن کی گذشتہ دینوں کے بانی ان سے پہلے تبلیغ کرتے رہے۔ پس اسلام صرف حضرت نبی کریم ﷺ سے شروع نہیں ہوا۔ بلکہ حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ حضرت کرشن، حضرت بدھ اور دوسرے تمام پیغمبروں کا مذہب ہے۔ جو دنیا میں خدا کا پیغام لاتے رہے۔

۶۔ اس دین کا نام نبی پاک حضرت محمدؐ کے نام پر کیوں نہیں رکھا گیا؟

صحیح بات تو یہی ہے کہ رسول اکرم صلعم مذہب اسلام کے بانی نہیں تھے بلکہ وہ خود بھی خدا کے کامل فرمانبردار ہونے کی حیثیت سے کامل مسلم تھے اور اسلام کے ایک کامل پیروکار تھے۔ قرآن شریف نے پہلے پیغمبروں کو بھی "مسلم یا مسلمان" کہا ہے۔ ہمارا دین حضرت نبی کریمؐ کے نام پر اس لئے بھی نہیں ہے کیونکہ حقیقت یہی ہے اور اس پر دین اسلام زور بھی دیتا ہے کہ یہ وہی بنیادی تعلیمات پیش کرتا ہے جو پہلے پیغمبروں نے پیش کیں۔ جو دنیا کے مختلف حصوں میں آپؐ سے پہلے مبعوث ہوئے۔

۷۔ کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے کہ ہمارے دین کو اسلام کہا جاتا ہے؟

ہاں۔ چونکہ یہ ہمیں سکھلاتا ہے کہ جس طرح ہمارے اردگرد کی دنیا خدا تعالیٰ کے قوانین کی پابند ہے اس لئے انسان کو خدا تعالیٰ کی راہنمائی قبول کرنی چاہئے۔ جو اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ نازل

کی- اسلام ہمیں سکھلاتا ہے کہ اللہ کی فرمانبرداری طبعی دنیا اور انسانی فطرت کا خاصا ہے- ہر انسانی بچہ پیدائشی طور پر اس لحاظ سے مسلمان ہوتا ہے کہ وہ انسانی فطرت کے عین مطابق حرکات کرتا ہے-

۸- اگر گذشتہ پیغمبر اسلام کی ہی بنیادی تعلیم دیتے تھے تو حضرت نبی اکرمؐ کی تعلیمات میں نئی کیا چیز ہے؟

دنیا میں مختلف اقوام کو جو اصلی تعلیم پیغمبروں کے ذریعے دی گئی تھیں- وہ آہستہ آہستہ بھلا دی گئی یا ان میں تحریف ہو گئی- یا وہ اپنی اصل حقیقت کھو بیٹھی- تب خدا تعالیٰ نے حضرت نبی اکرمؐ کو بھیجا تاکہ اصلی اصولوں کو دوبارہ قائم کیا جائے- اور ان سچائیوں کی بھی تعلیم دی جائے جو اس سے پیشتر نازل نہیں کی گئی تھیں اور یہ اس لئے بھی ضروری ہو گیا تھا کہ اب انسانیت ترقی کر گئی تھی- ہر مذہب کی بہترین تعلیمات کو اس ایک دین میں جمع کر دیا گیا ہے-

پس نبی اکرمؐ حضرت محمد صلعم آخری نبی کی حیثیت سے ظاہر ہوئے تاکہ تمام بنی نوع انسان کو ایک مکمل اور ہمیشہ رہنے والا دین یعنی "اسلام" کی روشنی دی جائے-

۹- کسی شخص کو اسلام قبول کرنے کیلئے کیا کرنا چاہئے؟

جو شخص مسلمان ہونا چاہے اسے چاہیے کہ وہ علی الاعلان سب کے سامنے کلمہ طیبہ کا اقرار کرے جو یہ ہے- **اشھد ان لاالہ الا اللہ** - یعنی میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں- **و اشھد ان محمد رسول اللہ** اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمدؐ اللہ کے رسول ہیں- کلمے میں دو بنیادی باتیں ہیں- ایک جس پر مسلمان کو ایمان لانا ہوتا ہے- یہ کہ خدا یعنی اللہ ایک ہے اور یہ کہ نبی اکرم حضرت محمد ﷺ اللہ کی طرف سے تمام انسانوں کے لئے رسول ہیں-

۲- بنیادی عقائد اور عبادات

"بڑی نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے مونہوں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو بڑا نیک وہ ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں اور کتابوں اور نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی محبت کے لئے قریبیوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوالیوں کو اور غلام کو آزاد کرنے میں مال دے اور نماز قائم کرے اور زکواۃ دے- اور اپنے اقرار کو پورا کرنے والے ہوں جب وہ اقرار کریں- اور صبر کرنے والے تنگی اور تکلیف میں اور مقابلہ کے وقت- یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے سچ کر دکھایا اور یہی متقی ہیں"- (۲:۱۷۷)

10- کیا مسلمانوں کے بنیادی عقائد کی کوئی فہرست ہے؟

ہاں- کلمہ طیبہ خود ہی دین کا مختصر ترین اظہار ہے- یہ تمام عقائد اور ارکان اسلام کا خلاصہ ہے- جن کی تعداد پانچ ہے جو درج ذیل ہیں-

(الف) خدا تعالیٰ معبود حقیقی ہے جو سب سے زیادہ مکمل اور بہترین صفات کا حامل ہے-

(ب) فرشتے جو ہر انسان کے دل پر اثر انداز ہوتے ہیں- نیکی کے جذبے کو ابھارتے ہیں-

(ج) خدا تعالیٰ کے پیغمبر اور رسول دنیا کی تمام اقوام کے طرف بھیجے گئے- جنہوں نے اپنے بلند اخلاق نمونہ کے ذریعے لوگوں کو نیکی کا سبق دیا-

(د) **خدا تعالیٰ کی کتب :-** یہ تمام قوموں کی طرف ان کے پیغمبروں کو وحی کے ذریعہ نازل ہوئیں تاکہ وہ لوگوں کو رہنمائی فراہم کریں اور یہ کہ کس طرح لوگ آپس میں رہیں اور ایک دوسرے سے معاملات کریں-

(ہ) **زندگی بعد الموت-** اس وقت ہر شخص اپنے تمام اچھے اور برے اعمال سے آگاہ ہو جائے گا جو اس مرد یا عورت نے زندگی میں کئے ہوں گے اور پھر وہ ان کے نتائج بھگتے گا-

۱۱- اسلام ایمان کے متعلق سب سے اہم کیا تعلیم دیتا ہے؟

ایمان صرف یہی نہیں کہ کسی چیز کو دل سے مان لیا جائے- بلکہ اس پر عمل بھی ضروری ہے- صرف ایمان سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا جب تک عمل نہ کیا جائے- ایمان کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ کس پر عمل کیا جائے- محض عقیدہ یا ایمان خود نجات کا باعث نہیں بن سکتا-

۱۲- ایمان پانچ ارکان اسلام پر کیسے اثر انداز ہوتا ہے؟

اس کا طریق حسب ذیل ہے-

عقیدہ / ارکان

خدا پر ایمان سے مراد ہے کہ اپنے نفس کی تکمیل کی کوشش کرنا اور اچھی صفات کو اپنانا-

فرشتوں پر ایمان سے مراد ہے کہ نیک خیالات اور جذبات کی پیروی کی جائے-

پیغمبروں پر ایمان سے مراد ہے کہ اپنی زندگیوں کو روئے زمین پر تمام قوموں کے سچے پیغمبروں اور نیک لوگوں کے نیک نمونہ کے مطابق ڈھالا جائے۔

کتابوں پر ایمان سے مراد ہے کہ تمام صداقتوں پر عمل کرنا جو کسی کتاب یا مذہب میں پائی جاتی ہوں۔

ایمان بالآخرت یا ایمان بعد الموت سے مراد ہے کہ یہ یقین کیا جائے کہ ہمارے تمام افعال خواہ اچھے ہوں یا برے، چھپ کر کئے جائیں یا ظاہری طور پر ان سب کا حساب ہو گا۔

۱۳۔ وہ کونسے فرائض ہیں جو ہر مسلمان کو بجالانا ضروری ہیں؟

خدا کے احکامات کو بجا لانے اور انسانوں کے ساتھ امن سے رہنے کے لئے ہر مسلمان کو چند فرائض کا ادا کرنا ضروری ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان کو حقوق اللہ و حقوق العباد کہا جاتا ہے۔ اللہ کے حقوق مندرجہ ذیل ہیں۔ نماز، روزہ، حج۔ حقوق العباد یہ ہیں کہ اپنے وسائل، وقت، قوت اور روپے وغیرہ کو دوسروں کی خیر خواہی کے لئے خرچ کیا جائے۔ خاص کر اپنی جائیداد کے ایک حصے سے ضرورت مند لوگوں کی مدد کرنا۔ اس کو زکواۃ کی ادائیگی بھی کہا جاتا ہے۔

۱۴۔ ان اعمال اور فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں کونسی اہم باتیں یاد رکھنی چاہئے؟

ان تمام فرائض کی ادائیگی کا سب سے بڑا مقصد خدا تعالیٰ کے قرب کو حاصل کرنا ہے۔ اور ایسی زندگی گزارنا ہے کہ دوسروں سے نیکی کی جائے اور اپنی روز مرہ زندگی میں دوسروں سے بدی کرنے سے بچا جائے۔ پس ہمیں یہ فرائض رسمی طور پر ادا نہیں کرنا چاہئیں بلکہ خدا تعالیٰ کو دل کی گہرائیوں سے یاد کرنا چاہئے۔ عبادت کے ان اعمال کی ادائیگی صرف اسی وقت ہمیں فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ اگر ہم ان کو اپنی روزمرہ زندگی میں کردار اور فعال کو بہتر بنانے کے لئے استعمال کریں۔ اگر کوئی شخص نماز پڑھتا اور روزہ رکھتا ہے لیکن وہ نیکیاں کرنے اور برائیوں کو ترک کرنے میں ناکام رہتا ہے تو اس کی نماز اور روزے بے سود ہوں گے۔

اللہ

اللہ۔ سوائے اس کے کوئی معبود نہیں۔ سب اچھے نام اسی کے ہیں (۸:۲۰) کہہ دیجئے۔ وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے۔ اس کا کوئی بیٹا نہیں اور نہ وہ کسی کا بیٹا ہے۔ اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ (سورۃ ۱۱۲)

۱۵۔ خدا تعالیٰ کے متعلق اسلام کی بنیادی تعلیم کیا ہے؟

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ صرف ایک ہی خدا ہے۔ جو اس تمام کائنات کا خالق اور منتظم ہے۔ وہ ہر لحاظ سے یکتا ہے۔ اس کی کوئی مثال نہیں۔ اور ایسی کوئی ہستی نہیں جو اس سے مشابہت رکھتی ہو۔ وہ تمام چیزوں کے متعلق مکمل خواص کا علم رکھتا ہے اور مخلوقات پر اس کا مکمل اختیار ہے وہ کسی چیز کا محتاج نہیں۔ جبکہ ہر چیز مکمل طور پر اس کی محتاج ہے۔ اس کی تمام صفات ہر لحاظ سے مکمل ہیں اور انسان کو صرف اسی کی عبادت کرنی چاہئے۔

۱۶۔ کیا خدا کا کوئی نام ایسا ہے جو مسلمان خاص طور پر استعمال کرتے ہیں؟

ہاں! اسلام کے مطابق خدا تعالیٰ کا ذاتی نام عربی لفظ اللہ ہے۔ ذاتی نام کا مطلب یہ ہے کہ یہ نام صرف اور صرف اسی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ بجائے اس کے کہ اس کی کسی خاص صفت کا ذکر کیا جائے۔

لفظ اللہ ظاہر کرتا ہے کہ خدا وہ ہستی ہے جس کی تمام صفات اور خوبیاں مکمل ترین ہیں۔ قرآن کریم خود یہ معانی بتاتا ہے "اللہ کے سب نام / صفات سب سے اچھے ہیں۔ (۷:۱۸۰)

خدا تعالیٰ کے نام دوسری زبانوں میں جیسے انگریزی میں گاڈ اردو میں خدا۔ صرف خدا تعالیٰ کی چند خاص صفات کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ صفات خدا تعالیٰ کے علاوہ دیگر خداؤں یا دیوی دیوتاؤں کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ تاہم اللہ صرف خدا تعالیٰ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

حضرت مولانا محمد علی کے انگریزی ترجمہ و تفسیر قرآن کو دور جدید کے ایک مفسر قرآن کا شاندار داد و تحسین

مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب کی آپ بیتی سے اقتباس

مد کے بعد جزر

الحاد و ارتداد کا یہ دور کہنا چاہیے کہ دس سال تک رہا ۰۹ء میں یا اس سے کچھ قبل ہی شروع ہوا تھا' اور ۱۸ء کی آخری سہ ماہی تک قائم رہا۔ دس سال کی مدت اب اس دور کے ختم ہو جانے اور پھر اس پر بھی اتنے دن گزر جانے کے بعد کچھ بڑی معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن ذرا تصور کے سامنے دوران الحاد والے زمانے کو لے آیئے' جب مدت "ماضی" نہیں تھی "حال" تھی' چل رہی تھی' اور قوت و شدت کے ساتھ چل رہی تھی۔ معاذ اللہ! کتنی لمبی معلوم ہو رہی تھی' معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ زندگی بھر کبھی ختم بھی ہو گی۔ اپنے کو بھی یہی محسوس ہو رہا تھا اور دیکھنے والوں کو بھی یہی' دوست و دشمن' مخالف و موافق' سب ہی کو (بجز گنتی کے دو چار اہل نظر کے' جنھوں نے اس کا عارضی ہونا اسی وقت بھانپ لیا تھا) ـــــ اگست ۱۸ء تھا کہ میں حیدر آباد سے لکھنؤ واپس آگیا۔ اور اب اپنے اسی شوق و تفحص کے طفیل مطالعہ مذہبی یا نیم مذہبی قسم کے فلسفیوں کا شروع ہو گیا۔ یورپ کے شوپنہائیر وغیرہ سے جلدی جلدی گزرتا ہوا' پہلا نمبر چین کے حکیم کنفوشس (CONFUSIUS) کا آیا' اس حکیم کی تعلیم اور جیسی بھی ہو' شوپنہائیر ہی کی طرح بہرحال خالص مادہ پرستانہ نہ تھی۔ اخلاقی عنصر اس حد تک غالب تھا کہ اس کے ڈانڈے روحانیت سے جا ملے تھے۔ اور عالم غیب سے کچھ نہ کچھ لگاؤ اسے حاصل تھا۔ کہنا چاہیے کہ یہ پہلا مطالعہ تھا جو خالص مادی و عنصری نقطہ نظر سے ہٹ کر کسی حکیم و فلسفی کا کیا ـــــ ذوق تجسس نے قدم اور آگے بڑھایا۔ اور اس منزل پر بڑی مدد ایک پرانے کالجی ساتھی ڈاکٹر محمد حفیظ سید سے ملی۔ اور بدھ مت اور جین مذہب اور تھیا سوفی کی طرف رہنمائی ہوتی چلی گئی۔ حکیم مطلق کی طرف سے ہدایت و تربیت کے مناسب حال سامان' ہر منزل بلکہ ہر قدم پر ہوتے رہتے ہیں!

پہلے ایک اور اہم اور گہری کتاب بدھ مت پر پڑھی' اور اس سے تاثر یہ پیدا ہوا کہ بدھ مت نرے مجموعہ اوہام کا نام نہیں' بلکہ اس کے اندر نفس بشری اور روح سے متعلق کچھ گہری حقیقتیں اور بصیرتیں بھی ہیں۔ پھر تھیا سوفی کی سیر شروع کی (اور ظاہر ہے کہ یہ سارے مطالعے انگریزی ہی کتابوں کی مدد سے رہے) تھیا سوفی کو ہندو تصوف یا ہندو فلسفہ تصوف سمجھئے' سارا زور روح اور اس کے تقلبات پر۔ رنگ کچھ حاضرات و عملیات سے ملتا ہوا۔ مسزاینی بسنت (جو مسیحی سے ہندو ہو گئی تھیں) اس کی روح رواں تھیں اور خصوصی مبلغ و مناد۔ اور بنارس کے فلسفی و درویش ڈاکٹر بھگوان داس (جن کا انتقال ابھی چند سال ہوئے ۹۰ سال سے اوپر کی عمر میں ہوا ہے) ہندو تصوف اور ہندو فلسفہ کے بہترین شارح و ترجمان ہوئے ہیں' ان دونوں کی تحریروں کو بہت کچھ پڑھا اور بہت کچھ ان سے سیکھا۔ اور مہاراشٹر کے تلک اور بنگال وجنوبی ہند کے آربند وگھوش کی بھی تحریریں پڑھ دینے کی کوشش اپنی والی جاری رکھی' اور اسی دور میں کرشن جی کی بھگوت گیتا کے بھی جتنے نسخے انگریزی میں مل سکے' پڑھ ڈالے۔ اس کتاب نے جیسے آنکھیں کھول دیں اور ایک بالکل ہی نیا عالم روحانیات یا ماوراء مادیات کا نظر آنے لگا۔ گاندھی جی کی بھی تحریریں اس زمانے میں کثرت سے نظر سے گزریں۔ چھوٹے بڑے ہر مادی واقعہ کا کائنات کی کوئی نہ کوئی روحانی توجیہہ و تعبیر ان کے قلم سے برابر دیکھنے میں آتی رہی' اور دل و دماغ کو متاثر کرتی رہی

ـــــ ڈیڑھ دو سال (۱۹ ۲۰ء) کے اس مسلسل مطالعہ کا حاصل یہ نکلا کہ فرنگی اور مادی فلسفہ کا جو بت دل میں بیٹھا ہوا تھا' وہ شکست ہو گیا' اور ذہن کو یہ صاف نظر آنے لگا کہ اسرار کائنات سے متعلق آخری توجیہہ اور قطعی تعبیران فرنگی مادئین کی نہیں بلکہ دنیا میں ایک سے ایک اعلیٰ و دل نشین توجیہیں اور تعبیریں اور بھی موجود ہیں۔ اور روحانیت کی دنیا سرتاسر وہم وجہل اور قابل مضحکہ و تحقیر نہیں' بلکہ حقیقی اور ٹھوس دنیا ہے' عزت وتوقیر کی مستحق عمق اور تحقیق وتدقیق کے اعتبار سے گوتم بدھ اور سری کرشن کی تعلیمات ہرگز کسی مل' کسی اسپنسر سے کم نہیں' بلکہ کہیں بڑھی ہوئی ہیں۔ اور حکمائے فرنگ ان کے مقابلہ میں بہت پست وسطحی نظر آنے لگے۔ اسلام سے ان تعلیمات کو بھی خاصہ بعد تھا' لیکن بہرحال اب مسائل حیات' اسرار کائنات سے متعلق نظر کے سامنے ایک بالکل نیا رخ آگیا۔ اور مادیت' لا ادریت وتشکیک کی جو سربفلک عمارت برسوں میں تعمیر ہوئی تھی' وہ دھڑام سے زمین پر آ رہی۔ دل اب اس عقیدہ پر آگیا ہے کہ مادیت کے علاوہ' اور اس سے کہیں ماورا و مافوق ایک دوسرا عالم روحانیت کا بھی ہے۔ جو اس مادی محسوسات' مرئیات ومشہودات ہی سب کچھ نہیں' ان کی تہہ میں اور ان سے بالاتر "غیب" اور مغیبات کا بھی ایک مستقل عالم اپناوجود رکھتا ہے ـــــ قرآن مجید نے بالکل شروع میں جو ایمان کا وصف ایمان بالغیب بتا دیا ہے۔ وہ بہت ہی پرحکمت ومعنی خیز ہے۔ پہلے نفس "غیب" پر تو ایمان ہو۔ پھراس کے جزئیات و تفصیلات بھی معلوم ہوتے رہیں گے' ہمارے مولوی صاحبان کو اس منزل ومقام کی کوئی قدر نہ ہو' لیکن در حقیقت یہ روحانیت کا اعتقاد' ایمان کی پہلی اور بڑی فتح مبین مادیت' الحاد وتشکیک کے لشکر پر تھی۔

اسی دور کی ابھی ابتدا ہی تھی کہ مولانا شبلی کی سیرۃ النبی کی جلد اول پریس سے باہر آگئی' کتاب شبلی کے قلم سے تھی۔ موضوع کچھ بھی سہی' کیسے نہ اس کو شوق کے ہاتھوں سے کھولتا اور اشتیاق کی آنکھوں سے پڑھتا' کھولی اور جب تک اول سے آخر تک پڑھ نہ لی دم نہ لیا' دل کا اصلی چور تو یہیں تھا۔ اور نفس شوم کو سب سے بڑی ٹھوکر جو لگی تھی وہ اسی سیرۃ اقدس ہی کے متعلق تو تھی۔ مستشرقین و محققین فرنگ کے حملوں کا اصل ہدف تو ذات رسالتؐ ہی تھی' خصوصاً" بہ سلسلہ غزوات ومحاربات' ظالموں نے بھی تو طرح طرح سے دل میں بٹھا دیا تھا کہ ذات مبارک نعوذ باللہ بالکل ایک ظالم فاتح کی تھی' شبلی نے (اللہ ان کی تربت ٹھنڈی رکھے) اصل دوا اسی درد کی کی' مرہم اسی زخم پر رکھا۔ اور کتاب جب بند کی تو چشم تصور کے سامنے رسول عربیؐ کی تصویر ایک بڑے مصلح ملک وقوم اور ایک رحم دل وفیاض حاکم کی تھی' جس کو اگر جدال وقتال سے کام لینا پڑا تھا تو پھر بالکل آخر درجہ میں' ہر طرح پر مجبور ہو کر' یہ مرتبہ یقیناً" آج ہر مسلمان کو رسول و نبی کے درجہ سے کہیں فرو تر نظر آئے گا اور شبلی کی کوئی قدر وقیمت نظر میں نہ آئے گی' لیکن اس کا حال ذرا اس کے دل سے پوچھئے جس کے دل میں نعوذ باللہ پورا بغض وعناد اس ذات اقدسؐ کی طرف سے جما ہوا تھا۔ شبلی کی کتاب کا یہ احسان میں کبھی بھولنے والا نہیں ـــــ ابو طالب ہاشمی کا مرتبہ اہل ایمان میں جو کچھ اور جیسا بھی ہو' بہرحال ابو لہب و ابو جہل کے خبث نفس سے اسے کیا نسبت!

تذکرہ کتابوں ہی کا مسلسل چل رہا ہے' اب ذرا دو منٹ کیلئے اس سے ہٹ کر بہ طور جملہ معترضہ ان شخصیتوں کے نام بھی سن لیجئے' جو اس درمیان میں مجھے اسلام سے قریب لانے میں معین ہوتی رہیں۔ سوال قدرۃ" یہاں پڑھنے والے کے ذہن میں یہ پیدا ہو گا کہ جب میرے تعلقات مسلمان دوستوں عزیزوں سے برابر قائم رہے' تو آخر ان لوگوں کی بڑی اکثریت کیوں خاموش رہی' ان میں سے بہتوں نے فریضہ تبلیغ' جلی یا خفی کیوں نہ ادا کیا! ـــــ جواب میں ایک حد تک تو نام' عام غفلت' جمود' بے حسی اور غلط قسم کی رواداری کا لے لیجئے' اور پھر دوسری بات یہ کہ اپنی حد تک تو ہاتھ پیر بہتوں نے مارے' لیکن میں کسی کو خاطر میں ہی کب لاتا تھا اور کسی کی کوششوں کا میرے اوپر اثر ہی کیا' فرنگی محل لکھنؤ کے ایک مشہور مولوی صاحب یوپی کے ایک مشہور شیخ طریقت' دلی کے ایک مشہور و معروف صوفی' ان سب نے اپنی اپنی کمندیں میرے اوپر پھینکیں' میں کسی کے ہتھے ہی نہ چڑھا۔

ہر چہ کردند از علاج و از دوا
رنج افزوں گشت و حاجت ناروا

ہاں ان مخلصانہ و حکیمانہ کوششیں پھر اگر تھوڑی بہت کسی کی چپکے چپکے کارگر ہوتی رہیں تو بس ان دو ہستیوں کی:۔

(ا) ایک الہ آباد کے نامور ظریف شاعر حضرت اکبرؒ' بحث ومناظرہ

کی انہوں نے کبھی چھاؤں بھی نہیں پڑنے دی' اور نہ کبھی پند و موعظت ہی کی طرح ڈالی۔ بس موقع بہ موقع اپنے میٹھے انداز میں کوئی بات چپکے سے ایسی کہہ گزرتے' جو دل میں اتر جاتی اور ذہن کو جیسے ٹھوکے دے دیتے کہ قبول حق کی گنجائش کچھ تو بہرحال پیدا ہو کر رہتی ـــــ ایک روز بولے کہ "کیوں صاحب' آپ نے تو کالج میں عربی لی تھی' پھراب بھی اس سے کچھ مناسبت قائم ہے؟ علم وزبان کوئی بھی ہو اس کی قدر تو کرنی ہی چاہیے"۔ میں نے کہا "اب اس کے لکھنے پڑھنے کا وقت کہاں ملتا ہے" بولے کہ "نہیں کچھ ایسا مشکل تو نہیں' قرآن کی بے مثل ادبیت کے تو اہل یورپ بھی قائل ہیں" اور سنا ہے کہ جرمن یونیورسٹیوں میں قرآن کے آخری پندرہ پارے عربی ادب کے کورس میں داخل ہیں' آپ عقائد نہیں' زبان ہی کے اعتبار سے قرآن سے ربط قائم رکھئے اور جتنے منٹ بھی روزانہ نکال سکتے ہوں اسے پڑھ لیا کریں' جتنے حصے آپ کی سمجھ میں نہ آئیں' انھیں چھوڑتے جائیے' اور یہ سمجھ لیجئے کہ وہ آپ کیلئے نہیں لیکن آخر کہیں تو کچھ فقرے آپ کو پسند آ ہی جائیں گے' بس انہیں فقروں کو دو چار بار پڑھ لیا کیجئے' اور آپ کے لئے کوئی قید باوضو ہونے کی نہیں"۔

یہ ایک نمونہ تھا ان کی تبلیغ کا۔

(۲) دوسری ہستی وقت کے نامور رہ نمائے ملک و ملت مولانا محمد علیؒ کی تھی' بڑی زور دار شخصیت ان کی تھی' اور میرے تو گویا محبوب ہی تھے' کبھی خط میں' اور کبھی زبانی' جہاں ذرا بھی موقع پاتے' ابل پڑتے' اور جوش و خروش کے ساتھ' کبھی ہنستے ہوئے' کبھی گرجتے ہوئے اور کبھی آنسو بہاتے ہوئے تبلیغ کر ڈالتے' ان کی عالی دماغی' ذہانت' علم' اخلاص کا پوری طرح قائل تھا اس لئے کبھی بھی کوئی گرانی دونوں کی تبلیغ سے نہ ہوئی اور دونوں حق نصح (خیر خواہی) ادا کر کے پورا اجر سمیٹتے رہے۔

ان دو بھاری بھرکم شخصیتوں کے بعد ایک تیسرا نام اور سن لیجئے' یہ اپنے ایک ساتھی مولوی عبد الباری ندوی تھے' اور آج جولائی ۱۹۶۷ء کے مولانا شاہ عبد الباری خلیفہ حضرت تھانویؒ۔ دھیما دھیما ان کا اچھا ہی اثر پڑتا رہا ـــــ اور لیجئے چوتھا نام ایک غیر مسلم کا تو رہا ہی جاتا ہے' یہ بنارس کے فاضل فلسفی اور درویش بابو بھگوان داس تھے' مادیت کے تاریک گڑھے سے نکلنے اور روحانیت کی روشنی میں لے آنے میں خاصہ دخل ان کو بھی ہے' ان کی تحریروں سے استفادہ کے علاوہ ملاقات کا موقع بھی ان سے اکثر ملتا رہا۔

گیتا کے مطالعہ کے بعد سے طبیعت میں رجحان تصوف کی جانب پیدا ہو گیا تھا' اور مسلم صوفیا کی کرامتوں اور ملفوظات سے اب وحشت نہیں رہی تھی' دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور خاصی کتابیں فارسی اور اردو کی دیکھ ڈالی تھیں۔ موثر شخصیتوں میں قابل ذکر نام ریوہ کے مشہور صوفی بزرگ حاجی وارث علی شاہ کا ہے۔ ان کے ملفوظات بڑے چاؤ سے پڑھتا' اور ان کے کرامات و خوارق کے چرچے بڑی عقیدت سے سننے لگا تھا واضح و شعوری طور پر مسلمان ہوئے بغیر۔

۱۹۱۹ء کا آخر تھا اپنے ایک عزیز سید ممتاز احمد بانسوی لکھنوی کے پاس مثنوی رومی کے چھ دفتر کان پور کے بہت صاف' روشن و خوش نما چھپے ہوئے دکھائی دیئے اور طبیعت للچا اٹھی' ان بچارے نے بڑی خوشی سے ایک ایک دفتر دینا شروع کر دیا ـــــ کتاب شروع کرنے کی دیر تھی کہ یہ معلوم ہوا کہ کسی نے جادو کر دیا۔ کتاب اب چھوڑنا چاہوں بھی تو کتاب مجھے نہیں چھوڑ رہی ہے۔ فارسی استعداد اپنی اس وقت تھی ہی کیا۔ سینکڑوں' ہزاروں شعر سمجھ میں خاک نہ آئے' اس پر بھی کشش و جاذبیت کا یہ عالم کہ بے اختیار پڑھتا چلا جاتا ہوں اور سر نہیں اٹھا پاتا ہوں۔ دیوانوں کی طرح ایک مستی بے سمجھے بوجھے ہی محسوس کر رہا ہوں! کہاں کا کھانا پینا' اور کیسا سونا' بس جی میں یہی کہ کمرہ بند کر کے خلوت میں کتاب پڑھے جایئے۔ کہیں کہیں آنسو بہایئے' بلکہ کہیں چیخ بھی پڑیئے! کتاب کے حاشئے غضب کے تھے' خصوصاً "مرشدنا قبلہ عالم" کے قلم سے نکلے ہوئے۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ "مرشدنا" حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے تھے) ـــــ یاد نہیں کتاب کتنے عرصے میں ختم کی۔ بہرحال جب بھی ختم کی' تو اتنا یاد ہے کہ دل ممتاز میاں کا نہایت درجہ احسان مند تھا کہ یہ نعمت بے بہا انھیں کے ذریعہ ہاتھ میں آئی تھی۔ شکوک و شبہات' بغیر کسی رد و قدح میں پڑے' اب دل سے کافور تھے' اور دل صاحب مثنوی پر ایمان لانے کیلئے بے قرار تھا! گویا خدا و رسول (نعوذ باللہ) سب کچھ وہی تھے ـــــ مسلمان بے شک اب بھی نہیں ہوا تھا' لیکن دل ملت کفر سے بالکل ہٹ چکا تھا' اور تشکیک و الحاد فرنگ پر لعنت بھیج رہا تھا۔

اسی دور میں تصوف کی فارسی کتابیں خاصی پڑھ ڈالیں' فرید الدین عطار کی منطق الطیر' جامی کی نفحات الانس وغیرہ' جی خوارق و عجائبات میں بہت لگتا تھا' اور کشف و کرامات کے قصے غایت اعتقاد و اشتیاق سے

سنا کرتا، لکھنؤ میں اسی گھر میں ایک خالہ زاد بھائی شیخ نعیم الزماں آکر رہے تھے، وہ خود ایک مستقل تذکرۃ الصوفیہ تھے، ان کی صحبت نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا، مزارات پر حاضری، عرسوں میں شرکت شروع ہو گئی، لکھنؤ میں بھی اور لکھنؤ کے باہر بھی۔ ریوہ کے حاجی وارث علی شاہ کو تو (نعوذ باللہ) کچھ دن تک حاضر وناظر ہی سمجھتا رہا ـــــ اسلام سے بعد مسافت اب روز بروز کم ہو رہا تھا اور ہر قدم اسی طرف بڑھ رہا تھا۔ گو قبر پرستی اور پیر پرستی کی راہ سے ہو کر۔

اسلام کی طرف بازگشت

ان تدریجی اندرونی تبدیلیوں کے ساتھ آہستہ آہستہ اسلام کی طرف آ رہا تھا۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ ۵۰ فی صدی سے زیادہ مسلمان ہو چکا تھا کہ اکتوبر ۲۰ء میں سفر دکن میں ایک عزیز ناظر یار جنگ کے ہاں اورنگ آباد میں قیام کا اتفاق ہوا۔ اور ان کے انگریزی کتب خانہ میں نظر محمد علی لاہوری احمدی (عرف عام میں قادیانی) کے انگریزی ترجمہ و تفسیر قرآن مجید پر پڑ گئی۔ بے تاب ہو کر الماری سے نکالا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ جوں جوں پڑھتا گیا الحمد للہ ایمان بڑھتا گیا۔ جس "صاحبانہ" ذہنیت میں اس وقت تک تھا، اس کا عین مقتضا یہ تھا کہ جو مطالب اردو میں بے اثر رہتے اور سپاٹ معلوم ہوتے، وہی انگریزی کے قالب میں جا کر مؤثر و جاندار بن جاتے۔ یہ کوئی مغالطۂ نفس ہو یا نہ ہو، بہرحال میرے حق میں تو حقیقت واقعہ بن کر رہا ـــــ اور اس انگریزی قرآن کو جب ختم کر کے دل کو ٹٹولا تو اپنے کو مسلمان ہی پایا۔ اور اب اپنے ضمیر کو دھوکا دیئے بغیر کلمہ شہادت بلا تامل پڑھ چکا تھا ـــــ اللہ اس محمد علی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ اس کا عقیدہ مرزا صاحب کے متعلق غلط تھا یا صحیح مجھے اس سے مطلق بحث نہیں، بہرحال اپنے ذاتی تجربہ کو کیا کروں، میرے کفر و ارتداد کے تابوت پر تو آخری کیل اسی نے ٹھونکی ـــــ جس اسلام سے دبے پاؤں چپکے چپکے باہر نکل گیا تھا، اللہ کی کریمی کہ اسی اسلام میں اسی طرح آہستہ آہستہ پھر داخل ہو گیا اور جس طرح اخراج وارتداد کا وقت بہ قید یوم و تاریخ متعین کرنا دشوار رہا، اسی طرح بازگشت کا بھی دن تاریخ متعین کرنا آسان نہیں۔ لیکن بہرحال اب اکتوبر ۲۰ء میں مکمل ہو چکی تھی۔

ضلالت مطالعہ کے راستہ سے پائی، ہدایت بھی بحمد للہ اس کی راہ سے نصیب ہوئی، اکبر کے مصرعہ

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

کی تصدیق آپ بیتی سے پوری طرح ہو کر رہی، زندہ شخصیتوں کو دخل خاص ان انقلابوں میں کم ہی رہا۔

ہندو فلسفہ اور جوگیانہ تصوف نے گویا کفر وایمان کے درمیان پل کا کام دیا۔ اس معروضہ کو وہ متقشف حضرات خاص طور پر نوٹ کر لیں، جو ہندو فلسفہ کے نام ہی سے بھڑکتے ہیں اور اسے یکسر کفر وضلالت کے مترادف قرار دیئے ہوئے ہیں، ہدایت کا ذریعہ بھی اسے باآسانی بنایا جا سکتا ہے، اور یہ حضرات اپنے جوش دین داری میں شبلی اور محمد علی لاہوری کی خدمت تبلیغ کو سرے سے نظر انداز نہ کر جائیں، میں نے تو دونوں کی دست گیری محسوس کی بلکہ اسپرٹ آف اسلام والے جسٹس امیر علی کے کام کو بھی حقیر نہ سمجھیں حالاں کہ وہ بچارے تو قرآن مجید کو شاید کلام محمدؐ ہی سمجھتے تھے۔ اپنی سرگزشت کا تو خلاصہ یہی ہے کہ جس فکری منزل میں میں اس وقت تھا، حضرت تھانوی جیسے بزرگوں کی تحریروں کو نا قابل التفات ٹھہراتا، ان کی طرف نظر تک نہ اٹھاتا۔ اور ان کے وعظ و تلقین سے الٹا ہی اثر قبول کرتا۔ غذا لطیف و تقویت بخش سہی، لیکن اگر مریض کے معدہ سے مناسبت نہیں ہو گی تو الٹی مضر ہی پڑے گی۔

دولت ایمان کی تو اب بے شبہ نصیب ہو گئی تھی، لیکن ابھی رواجی تصوف و خانقاہی مشیخیت میں ٹھوکریں کھا رہا تھا، درگاہوں پر حاضری اور عرسوں میں شرکت کا زور تھا۔ آج آستانہ اجمیر پر حاضری دی، تو کل درگاہ خواجہ بختیار قطب کاکی پر، لکھنؤ کی درگاہوں (شاہ میناء اور صوفی عبد الرحمٰن) کے پھیرے تو ہوتے ہی رہتے اور جوار کے مزارات ردولی، بانسہ اور ریوہ کے چکر برابر کاٹتا رہتا۔ خصوصی نسبت جا کر حضرت نظام الدین اولیاء سے قائم ہوئی اور مدتوں اسی کے طفیل میں مہمان خواجہ حسن نظامی کا جا کر ہوتا رہا۔ ۱۹۲۱ء کا آغاز تھا کہ لکھنؤ سے دریا باد منتقل ہو آیا اور یہیں کی سکونت اختیار کر لی۔ دو سال متصل عرس اپنے مورث اعلیٰ مخدوم آ بکش دریا بادی کا دھوم دھام سے کیا اور زور دار محفلیں قوالی کی کرائیں۔ ۲۲ء کی پہلی سہ ماہی تھی کہ وجد آفریں نعتیہ غزلیں مولانا محمد علی کی ہاتھ آ گئیں اور ان پر خود بھی غزلیں کہہ کر انھیں قوالوں سے گوایا۔ اتفاق سے دریا باد میں قوال بھی خوب ہاتھ آ گئے۔ خصوصا" افضل مرحوم" سماع جیسے روز مرہ کے معمولات میں داخل ہو گیا۔ اور رفتہ رفتہ گریہ بھی طاری ہونے لگا۔

خصوصاً" صبح کے وقت کی بھیرویں میں' اور نعتیہ غزلوں پر تو خوب یاد ہے کہ پہلی بار جس مضمون پر آنسو بے اختیار جاری ہو گئے تھے' وہ جامی کی ایک مشہور غزل کا مطلع تھا۔

بہ خرام باز جلوہ دہ آں سرو ناز را
پا مال خویش کن سر اہل نیاز را

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کا نام مبارک سن' بارہا آنسو بے اختیار بھر آئے' بزرگوں کو خواب میں بارہا دیکھا۔ اور زندہ اہل دل و اہل طریق کی زیارتیں بھی بارہا ہوئیں۔

یہ دور کوئی ڈھائی تین سال قائم رہا۔ ۲۳ء کا غالباً" ستمبر تھا' کہ مکتوبات مجدد سرہندی کے مطالعہ کی توفیق ہوئی۔ بڑا اچھا نسخہ' خوب خوش خط و روشن اچھے کاغذ پر' حاشیہ کے ساتھ (مثنوی کے کان پوری ایڈیشن کی طرح) نو حصوں میں امرتسر کا چھپا ہوا مل گیا۔ اس نے طبیعت پر تقریباً" ویسا ہی گہرا اثر ڈالا' جیسا تین چار سال قبل مثنوی سے پڑ چکا تھا' فرق اتنا تھا کہ مثنوی نے جوش و مستی کی ایک گرمی سی پیدا کر دی تھی۔ بجائے ادھر ادھر کی آوارہ گردی اور ہر صاحب مزار وصاحب آستانہ سے لو لگانے کے' اب متعین شاہراہ اتباع شریعت کی مل گئی۔ منزل مقصود متعین ہو گئی کہ وہ رضائے الٰہی ہے' اور اس کے حصول و وصول کا ذریعہ اتباع احکام مصطفویؐ ہے ـــــــ مثنوی اور مکتوبات دونوں کا یہ احسان' عمر بھر بھولنے والا نہیں' راہ ہدایت جو کچھ نصیب ہوئی' کہنا چاہیے کہ بالآخر انھیں دونوں کے مطالعہ کا ثمرہ ہے۔ اور یہ اس صورت میں جب کہ دونوں کا مطالعہ بغیر کسی استاد کی رہ نمائی' اور اپنی کم استعدادی کی بنا پر تمام تر سطحی اور سرسری ہی رہا۔

اب مطالعہ خالص دینی کتابوں کا شروع کیا' اور کالج کی پڑھی ہوئی ٹوٹی پھوٹی عربی کام آئی' تفسیر' حدیث' فقہ' کلام کی کتابوں کی ورق گردانی شوق و سرگرمی سے کر ڈالی' زیادہ تر اردو ترجموں کا سہارا لئے ہوئے۔ بحمد اللہ ان علوم کی مہمات کتب اردو میں اکثر منتقل ہو آئی ہیں۔ قرآن مجید کے اردو اور فارسی ترجمے ہاتھ لگ گئے' سب ایک ایک کر کے کھنگال ڈالے۔ پھر نوبت بیضاوی' کشاف وغیرہ کی آئی' حدیث کے سارے دفتر تو خیر کیا پڑھتا۔ صحاح کے جستہ جستہ مقامات اپنے مذاق کے کچھ نہ کچھ پڑھ ہی لئے' اسی فقہ کی زیادہ مشہور و متداول کتابوں کے' اپنے کام کے ٹکڑے ترجموں اور حاشیوں کی مدد سے دیکھ لئے۔ لغت قرآن لغت حدیث' لغت فقہ پر جو کتابیں ہاتھ آ گئیں' ان سے بھی کام لینے لگا۔ پڑھ ڈالنے کا جو مرض شروع سے تھا' وہ اس وقت بھی کام آیا اور سمجھے اور بے سمجھے بہت سارے اوراق چاٹ گیا۔

لکھنؤ میں ایک صاحب دل بزرگ تھے' مولوی عبد الاحد کمنڈوی' بہ ظاہر کلکٹری میں ملازم" لیکن صاحب باطن' ان کی خدمت میں بہت شوخ بلکہ ڈھیٹ رہا' متوفی ۱۹۲۹ء جوار بارہ بنکی میں ایک اور بزرگ تھے' مولوی عابد حسین فتح پوری' صاحب علم' متبع شریعت و صاحب نسبت (متوفی ۱۹۲۷ء) ان دونوں سے بھی بقدر اپنے ظرف و بساط کے استفادہ رہا۔ سب سے بڑھ کر استفادہ ایمانی مولانا محمد علی جوہر (متوفی ۱۹۳۱ء) سے رہا۔ دیکھنے میں نہ درویش' نہ عالم' نہ مصلح' لیکن حقیقت میں دس درویشوں کے ایک درویش۔ حرارت ایمان کے ایک دہکتے ہوئے تنور' عشق رسول و عشق قرآن کو گویا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے' اپنے ایمان میں اگر جان پڑی تو انھیں کے فیض صحبت سے' خیر ۲۳ء سے اخیر ۳۰ء تک ان سے بارہا ملاقاتیں رہیں' اکثر تو لکھنؤ اور دہلی میں' اور کبھی بمبئی' علی گڑھ وغیرہ میں بھی۔ ہر صحبت ازدیاد ایمان ہی کا باعث ہوتی رہی ـــــــ خلافت کمیٹی ہی کے سلسلے میں نیاز مولانا حسین احمد صاحب سے پہلے کان پور میں دسمبر ۱۹۲۵ء میں حاصل ہوا' پھر دیوبند' لکھنؤ' سہارن پور' اور خود دریا باد میں حاصل ہوتا رہا۔ جولائی ۲۸ء میں انھیں کی وساطت سے رسائی حضرت تھانویؒ تک ہوئی اور حضرت تھانوی سے جس قدر استفادہ دینی' روحانی' اخلاقی حیثیت سے ہوا' وہ حد بیان سے باہر ہے' حضرت ہی کے ایک شاگرد اور بڑے صاحب کمال حاجی محمد شفیع بجنوری (متوفی ۱۱ ستمبر ۱۹۵۱ء ذی الحجہ ۱۳۷۰) اس درجہ مہربان ہوئے کہ بالکل عزیز قریب معلوم ہونے لگے ـــــــ اللہ ان سب اللہ والوں کو مرتبہ اعلیٰ سے سرفراز فرمائے۔ ایک بے مایہ عامی و عاصی' ان سب احسانات کے عوض میں بجز دعائے خیر کے اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ (آپ بیتی : مولانا عبد الماجد دریا بادی ص ص ۲۴۵-۲۵۹)

یادِ رفتگان

مرتبہ: ممتاز احمد باجوہ ایم۔ اے ایم ایڈ

محترم مرزا ولی احمد بیگ صاحب مرحوم کے حالات زندگی

انڈونیشیا میں تحریک احمدیہ لاہور کے پہلے اور ممتاز مبلغ

غالباً ۱۹۲۴ء کا ذکر ہے کہ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام، لاہور نے جاوا سماٹرا میں ایک تبلیغی مشن قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ ان دنوں جاوا۔ سماٹرا پر ہالینڈ کی حکومت تھی۔ مسلمانوں کی اقتصادی اور تعلیمی حالت بہت پست تھی۔ انجمن نے جنوب مشرقی ایشیاء کے اس خطے کے لئے تین مبلغوں کا انتخاب کیا۔ حضرت مولانا احمد صاحب مرحوم، (پشاور) حافظ محمد حسن صاحب چیمہ مرحوم (گجرات) اور مرزا ولی احمد بیگ صاحب مرحوم۔

محترم حافظ صاحب نے گجرات میں اپنی چلتی ہوئی وکالت چھوڑ کر محض رضائے الٰہی کی خاطر اور دین اسلام کی تبلیغ کے لئے یہ سفر اختیار کیا۔ لیکن انجمن اسلامیہ سنگاپور کی درخواست پر وہیں ٹھہر گئے۔ بعد ازاں تحریک احمدیت کے روشن خیال نظریات کی وجہ سے انجمن مذکور کا حافظ صاحب سے نبھا نہ ہو سکا اور حافظ صاحب مرحوم کو تھوڑے عرصہ بعد واپس آنا پڑا۔

حضرت مولانا احمد صاحب مرحوم اور مرزا ولی احمد بیگ صاحب مرحوم جاوا پہنچ گئے۔ حضرت مولانا احمد صاحب کو وہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی اور بیمار ہو گئے۔ تین چار ماہ وہاں رہ کر واپس چلے آئے۔ اب مرزا ولی احمد بیگ صاحب مرحوم وہاں اکیلے رہ گئے۔

ابتدائی حالات

مرزا ولی احمد بیگ صاحب مرحوم کا تعلق گجرات کاٹھیاوار کے علاقہ سے تھا۔ ان کی پیدائش غالباً ۱۸۷۲ء میں ہوئی ہے۔ پوتا (انڈیا) سے اپنی تعلیم مکمل کر کے ممبئی کے ایک کالج میں ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔

حضرت مولانا محمد علی صاحب سے تعارف

اس ملازمت کے دوران آپ کو حضرت مولانا محمد علی صاحب مرحوم کی انگریزی تفسیر کے مطالعہ کا موقع ملا۔ ان کی تفسیر نے ان کے دل میں گھر کر لیا۔ اس طرح مرزا ولی احمد بیگ صاحب کو حضرت مولانا صاحب سے ملنے کا شوق پیدا ہوا۔ خدا نے اپنی حکمت بالغہ کے تحت ان کی خواہش کو پورا کرنے کا بندوبست بھی کر دیا۔ جس کالج کے ہوسٹل کے وہ نگران تھے اس کی انتظامیہ کو پشاور کے ایک ذی مقدرت شخص نے اپنا کوئی نمائندہ پشاور بھیجنے کی ہدایت کی تاکہ وہ ان کے دو بچوں کو ساتھ لیکر بمبئی آئے اور کالج میں ان بچوں کے داخلے کا بندوبست ہو سکے۔ یہ ذمہ داری محترم مرزا ولی احمد بیگ کے سپرد کی گئی۔ ممبئی سے روانہ ہونے سے پہلے اطلاع ملی کہ بچے لاہور پہنچ چکے ہیں۔ لہذا متعلقہ آدمی لاہور پہنچ کر ان بچوں کو اپنی نگرانی میں لے لے۔

چنانچہ مرزا ولی احمد بیگ صاحب مرحوم پشاور جانے کی بجائے لاہور روانہ ہوئے۔ احمدیہ بلڈنگس میں قیام کیا۔ اور اس طرح حضرت امیر مولانا محمد علی صاحب سے ملاقات کا موقع مل گیا۔ حضرت مولانا کے درس قرآن میں شریک ہوئے۔ چند دنوں کے بعد مرزا بیگ صاحب نے حضرت امیر مولانا محمد علی صاحب سے واپسی کی اجازت مانگی تو حضرت مولانا مرحوم نے فرمایا کہ یہ جگہ آپ کے لئے بہتر ہے اس لئے واپسی کا خیال ترک کر دیں۔ مرزا صاحب نے نہ صرف واپسی کا ارادہ ترک کر دیا بلکہ جماعت میں شمولیت اختیار کر کے یہیں مستقل قیام اختیار کر لیا۔ اور اپنی خدمات انجمن کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا۔

جب جاوا سے محترم مولانا احمد صاحب مرحوم اپنی علالت کے باعث واپس آ گئے تو مرزا ولی احمد بیگ صاحب اکیلے رہ گئے۔ ایک اجنبی ملک ڈچ زبان سے بالکل نابلد اور نامساعد حالات کی وجہ سے محترم مرزا ولی احمد بیگ صاحب کو ابتداء میں کافی مشکلات کا سامنا رہا لیکن انہوں نے حوصلہ نہ ہارا۔ اور تعلیم و تدریس کے کام میں لگے

رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی کوشش سے تیرہ چودہ سال کے قلیل عرصہ میں تحریک احمدیت کے ذریعہ اسلام ایک انقلابی مذہب کے طور پر اس ملک میں ابھرا۔ مسلمان جو اب کثرت سے عیسائیت قبول کر رہے تھے۔ واپس اسلام میں آنے لگے اور عیسائیت کے خلاف انہوں نے محاذ قائم کر لیا۔ کثرت سے لوگ جماعت میں داخل ہوئے۔ قرآن کریم اور دیگر احمدی مصنفین کی کتب کا ڈچ اور علاقائی زبانوں میں تراجم شائع ہونے لگے۔

۱۹ دسمبر ۱۹۳۷ء کو جب محترم مرزا ولی احمد بیگ صاحب ۱۴ سال کے بعد جاوا سے تشریف لائے تو ان کا ذکر کرتے حضرت مولانا محمد علی صاحب نے ۲۲ نومبر ۱۹۳۷ء کے خطبہ جمعہ میں فرمایا۔

"خدا کا فضل ہے کہ اس زمانے میں بھی حضرت مسیح موعودؑ کی روحانی طاقت نے ایسے آدمی پیدا کئے ہیں جو جدوجہد اور خاکساری کے لحاظ سے صحابہ کرامؓ کے نقش قدم پر ہیں۔ اگر مجھے اپنی جماعت میں سے کام اور خاکساری کا نمونہ پیش کرنے کی ضرورت ہو تو میں مرزا ولی احمد بیگ کا نام لوں گا"۔ اور بتایا کس طرح ایک وسیع ملک کی ساڑھے پانچ کروڑ آبادی میں انہوں نے اپنی تبلیغی کوششوں سے بیداری پیدا کی ہے۔ موجودہ عیسایت کے خلاف انڈونیشیا میں محاذ قائم کیا۔ آج سے ۱۴ سال پہلے جب مرزا صاحب کو الوداعی جلسہ میں تقریر کرنے کو کہا گیا تو انہوں نے صرف یہ کہا تھا اب کیا کہوں۔ اگر کچھ کر سکا تو واپس آ کر کہوں گا۔ پھر چودہ سالوں میں انہوں نے بے مثال کام کیا۔ ایک مضبوط جماعت قائم کی ملک کو اسلامی لٹریچر سے بھر دیا۔ ہماری اہم کتب اور کتابچوں کا ڈچ زبان میں ترجمہ کروایا۔ آج وہی انکساری اور خاکساری کا مجسمہ مرزا ولی احمد بیگ واپس آئے ہیں۔ وہ یہاں سے نوجوانی میں گئے تھے اب بڑھاپے اور بیماریوں کو ساتھ لیکر آئے ہیں۔ پھر بھی کوئی گلہ نہیں۔ کوئی شکایت نہیں۔ پھر حضرت مولانا نے جماعت کے مبلغوں اور جماعت کو ایسے نمونے پیدا کرنے کی تلقین کی کہ کام کرتے ہوئے نہ تھکیں اور پھر ساتھ ہی یہ سمجھیں بھی کہ ابھی کچھ نہیں کیا۔ (مجاہد کبیر' ممتاز فاروقی صفحہ ۱۸۶)

تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز

محترم مرزا ولی احمد بیگ صاحب نے انڈونیشیا کے قیام کے دوران سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وہاں کی عوامی اور سرکاری زبانوں (جاوی' ملائی اور ڈچ) سے واقفیت حاصل کی۔ اس امر کا ذکر کر دینا بھی مناسب ہو گا کہ اس وقت تک آپ کو اردو' فارسی' عربی' انگریزی اور گجراتی زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ چنانچہ انہوں نے ملائی' جاوی اور ڈچ زبانوں کے ایک سکالر کو جو اسلام میں دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ مرزا صاحب کو زبانیں سکھا دے۔ دوسری طرف اسلام کو سمجھنے کے لئے عربی کا علم بڑا ضروری تھا چنانچہ اس عالم کو عربی سکھانے کا کام محترم مرزا صاحب نے اپنے ذمہ لیا۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے کے استاد و شاگرد بن گئے۔ اور تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان زبانوں پر عبور حاصل کرنے کے بعد تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔

احمدیہ انجمن اشاعت اسلام' لاہور کی سالانہ رپورٹوں میں ان کی سرگرمیوں اور تبلیغی جدوجہد کا نمایاں طور پر ذکر تفصیل سے موجود ہے۔ خلاصہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

۱۹۲۴ء-۱۹۲۵ء: مقامی زبانوں پر عبور حاصل کرنے کے بعد ان زبانوں میں ٹریکٹ اور اشتہارات نکالنے شروع کئے۔ اخبارات میں مضامین شائع ہونے لگے۔ ان مضامین کا سلسلہ اس قدر مقبول ہوا کہ اخبارات خود محترم مرزا صاحب سے مضامین کیلئے اصرار کرنے لگے۔ پہلے سال سیرت خیرالبشر۔ اسلامی اصول کی فلاسفی۔ ینابیع المسیحیت کا ترجمہ شائع ہوا۔ مختلف مقامات پر درس قرآن کریم کا سلسلہ شروع ہوا۔ سنگاپور والوں نے ان تبلیغی سرگرمیوں کے خلاف محاذ کھولا۔ جاوا سے مخالف علماء بھیجے گئے لیکن خدا کے فضل سے ان کے شر سے محترم مرزا صاحب اور ہماری جماعت محفوظ رہی۔

۱۹۲۵ء-۱۹۲۶ء: محترم مرزا ولی احمد بیگ صاحب نے اپنا کام محنت اور لگن سے جاری رکھا اور مندرجہ ذیل مقاصد پر نہایت سرگرمی سے کام کیا۔ (I) مسلمانوں کو عیسائیوں کے حملوں سے بچانا۔ (II) تعلیم یافتہ لوگوں کو احمدی نظریات سے روشناس کرانا۔

خدا کے فضل سے ان دونوں مقاصد میں اللہ تعالیٰ نے ان کو کامیابی عطا کی۔

نوجوانوں میں درس و تدریس نے نئی روح پھونک دی ہے۔ کئی نئی کتب کا ترجمہ مقامی زبانوں میں شائع ہوا۔

بیان القرآن کا ملائی زبان میں ترجمہ شروع کیا گیا ہے۔ اس کی اشاعت کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے کافی سرمایہ جمع کر لیا ہے۔

۱۹۲۶ء-۱۹۲۷ء: محترم مرزا صاحب ایک انجمن کا کام کر رہے

ہیں۔ نوجوانوں کو عیسائیت کے اثر سے نکال کر پکا اور سچا مسلمان بنانے کا کام بڑی جانفشانی سے کر رہے ہیں۔ بہت سی نئی کتب کا جاوی اور ملائی زبانوں میں ترجمہ ہو رہا ہے۔ قرآن کریم کے ترجمے کا کام بھی قریب الاختتام ہے۔ سیرت النبی۔ اسلامی اصولوں کی فلاسفی اور محمد اینڈ کرائسٹ کا ترجمہ ڈچ اور ملائی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ہمارے نظریات کا اثر جزائر سے نکل کر ہالینڈ تک پہنچ گیا ہے۔ محترم مرزا صاحب نے اپنے ساتھ دو ساتھی تیار کر لئے ہیں جو لاہور سے دینی علم حاصل کر کے واپس جا چکے ہیں۔ انڈونیشیا جماعت کا اخبار نکالنے کی تیاری ہو رہی ہے۔

۱۹۲۷ء۔۱۹۲۸ء : مرزا ولی احمد بیگ صاحب پوری تندہی سے کام کر رہے ہیں مخالفین اسلام اور مخالفین احمدیت کا کامیابی سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ ہمارا اثر مسلسل بڑھ رہا ہے۔ جگہ جگہ مراکز اور جماعتیں قائم ہو رہی ہیں۔ جاوی زبان میں اخبار شائع ہو چکا ہے۔

۱۹۲۸ء۔۱۹۲۹ء : مرزا ولی احمد بیگ صاحب ایک جوشیلے اور محنتی انسان ہیں ان کی کوشش سے مخالفت کے باوجود تبلیغی سرگرمیاں کامیابی سے ترقی کر رہی ہیں۔ تحریک احمدیت مقبول ہو رہی ہے۔ مختلف جزائر میں دو صد افراد نے جماعت میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔ احمدیہ موومنٹ انڈونیشیا کے نام سے مرکز قائم ہو چکا ہے۔ اس انجمن نے مختلف کتب کا ترجمہ ملائی اور ڈچ زبانوں میں شائع کیا ہے۔ قاضی معروف حسین، قاضی سنجرائی، محمد حسن اور مفتی شریف جیسے عالم اور زباندان لوگ جماعت میں شامل ہو چکے ہیں۔ اور تراجم اور تصنیف کے کام میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ انجمن کے سالانہ جلسے میں ۳۰۰ افراد نے شرکت کی۔ قرآن شریف کا ڈچ زبان میں ترجمہ شائع کرنے کا فیصلہ ہوا ہے اور ہالینڈ میں مشن کھولنے کی تجویز پر بھی غور ہوا ملک کے مختلف علاقوں میں مبلغین بھیجے گئے ہیں۔

۱۹۲۹ء۔۱۹۳۰ء : سرکاری ملازمین میں تبلیغ کا کام ہوا۔

چینی نژاد اور دیگر طبقوں میں تبلیغ کے لئے اقدامات کئے گئے۔

مبلغین تیار کرنے اور نوجوانوں کو معلم بنانے اور دنیاوی علوم سے بہرہ ور ہونے کے علاوہ دینی تربیت کے لئے احمدیہ ٹریننگ ہائی سکول قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جماعت کا ماہوار رسالہ "احمدیہ" بہت مفید کام کر رہا ہے۔ ڈچ ترجمۃ القرآن کو ہالینڈ میں چھپوانے کا فیصلہ کیا گیا اخراجات کا زیادہ حصہ جاوا جماعت ادا کرے گی۔ چند غیر از جماعت احباب نے بھی اس کار خیر میں حصہ لیا ہے۔

یکم فروری ۱۹۳۰ء سے جماعت کا مرکز جکارتہ منتقل ہو گیا ہے۔ جاوہ مشن کے ذریعہ ہالینڈ اور دیگر ڈچ کالونیوں میں بھی مسلمانوں میں بیداری پیدا ہو رہی ہے۔

۱۹۳۱ء۔۱۹۳۲ء : انڈونیشیا احمدیہ انجمن دو اخبار ڈچ اور جاوی زبان میں شائع کر رہی ہے۔ ہمارے ایک احمدی بھائی ایک ملائی اخبار کے چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے ہیں جو ہماری تقویت کا باعث ہوں گے۔ اس سال تیسرا سالانہ جلسہ ہوا۔ جس میں ممبران نے بھرپور انداز میں حصہ لیا۔ مرکزی مسجد کے علاوہ دیگر شہروں میں بھی مساجد کی تعمیر کا کام شروع ہے۔ چینی لوگوں میں بھی اشاعت اسلام کا کام بتدریج آگے بڑھ رہا ہے۔ اس سارے کام کا سہرا محترم مرزا ولی احمد بیگ صاحب کے سر ہے۔

۱۹۳۲ء۔۱۹۳۳ء : کے جلسہ سالانہ میں ایک ہزار افراد شریک ہوئے۔ محترم مرزا صاحب مبلغ انڈونیشیا نے گزشتہ دس سال کے مدوجزر کی تاریخ بیان کی۔ مسلمانوں کی موجودہ دنیاوی اور دینی پسماندگی کو بیان کیا۔ تحریک احمدیت کے روشن خیالات، دلائل، عقائد اور تبلیغی کوششوں کے ذریعہ مسلمانوں میں جو بیداری پیدا ہوئی۔ اس کی تفصیل بیان کی اور قرآن کریم اور اسوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق احمدی لٹریچر کا مقامی زبانوں میں اشاعت کے ذریعہ جو اہم کردار ادا کیا۔ اس کی تفصیل بیان کی کہ یہ سب کچھ مجدد وقت حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی علمی اور روحانی بصیرت کا نتیجہ ہے۔

۱۹۳۳ء۔۱۹۳۴ء : ڈچ ترجمۃ القرآن کی طباعت کا کام ہو رہا ہے۔ قرآن مجید کا دیباچہ الگ چھپا گیا ہے۔ جو ہاتھوں ہاتھ بک رہا ہے۔ لوگ پیشگی قیمت ادا کر رہے ہیں۔ ہالینڈ میں مشن کھولنے کی تیاریاں زوروں پر ہیں۔ چند مزید کتب بھی مقامی زبانوں میں شائع ہوئیں۔

۱۹۳۴ء۔۱۹۳۵ء : خدا کے فضل سے ڈچ ترجمۃ القرآن شائع ہو گیا ہے۔ مرکز میں بھی چند کاپیاں پہنچ چکی ہیں۔ مترجم کا نام مرزا صاحب نے اپنے پہلے شاگرد اور استاد جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ درج کیا ہے حالانکہ ترجمہ کے کام میں محترم مرزا صاحب نے بڑی محنت کی ہے لیکن اس کے باوجود بے نفسی دیکھیں کہ اپنا نام نہ دیا۔

انہوں نے صرف مترجم کا نام دیا اور اپنا ذکر تک نہ کیا۔ جاوا کے ایک مشہور اخبار نے ڈچ ترجمہ کے متعلق لکھا ہے۔

"اب تک ہم سمجھتے تھے کہ یہ لوگ غیر مہذب ہیں۔ اس لئے ان کو عیسائیت کی روشنی سے سیدھا راستہ دکھایا جا رہا ہے۔ لیکن یہ لوگ اب اتنے مہذب ہو گئے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کرنے کا تہیہ کر لیا ہے" ڈچ ترجمہ اتنا مقبول ہوا کہ ایک سال میں پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔

۱۹۳۵ء-۱۹۳۶ء میں ڈچ ترجمہ القرآن کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ ایک نئے تبلیغی سکول کا بھی اضافہ ہوا۔ فیصلہ ہوا کہ اگلے سال ہالینڈ مشن قائم کیا جائے۔ ڈچ ترجمۃ القرآن کے مترجم ہالینڈ مشن کے انچارج ہوں گے۔

۱۹۳۶ء-۱۹۳۷ء: جلسہ سالانہ پہلے سے زیادہ کامیاب رہا۔ مخالفین کی خاصی بڑی تعداد نے بھی شرکت کی۔ ریلجین آف اسلام کا ڈچ میں ترجمہ ہوا۔ تبلیغی سکول میں دس طلباء زیر تعلیم ہیں۔ جملہ جدوجہد ایک فرد واحد مرزا ولی احمد بیگ کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ جاوا کے لوگوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ جب سے محترم مرزا صاحب وہاں گئے ہیں کام میں اتنے مصروف ہو گئے کہ واپسی کا خیال تک نہ آیا۔ چودہ سال ہو گئے ہیں۔ کام کی خاطر اپنی صحت کا بھی دھیان نہ رکھا۔ اب مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ صحت کافی خراب ہو گئی ہے۔ مجبوراً" واپسی کا فیصلہ کیا ہے۔

۱۲ دسمبر ۱۹۳۷ء کو محترم مرزا ولی احمد بیگ صاحب لاہور واپس پہنچ گئے۔ اگرچہ واپسی کا ارادہ کر کے آئے تھے لیکن ہالینڈ میں مشن کے قیام کا خیال ذہن میں سمایا رہا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں وہ کوشش کرتے رہے اور اس غرض سے عارضی طور پر ۱۹۳۸ء کے شروع میں مسلم مشن ووکنگ تشریف لے گئے۔

۱۹۳۸ء-۱۹۳۹ء: جاوا میں قیام کے دوران ہی محترم مرزا صاحب کے ہالینڈ میں مشن قائم کرنے کی انجمن سے اجازت حاصل کر لی تھی۔ لیکن معاملہ محدود ذرائع کی وجہ سے ملتوی ہوتا چلا گیا۔ آخر مرزا صاحب خود ہی ہالینڈ پہنچ گئے۔ اور فروری ۱۹۳۹ء میں ہالینڈ مشن کی بنیاد رکھی گئی۔ جماعت کے مخیر حضرات مثلاً" سید ڈاکٹر محمد حسین شاہ صاحب نے اس مشن کے لئے گراں قدر عطیہ عنایت فرمایا۔ آپ کی وفات کے بعد ان کی بیگم صاحبہ۔ ان کے فرزند سید الطاف حسین اور سید کرنل بشیر حسین صاحب نے مشن کی امداد جاری رکھی۔ ان کے علاوہ میاں نصیر احمد فاروقی اور شیخ مولا بخش صاحب لائل پوری نے بھی اس امداد میں وافر حصہ لیا۔

۱۹۳۹ء-۱۹۴۶ء: اس دوران دوسری عالمگیر جنگ شروع ہو گئی جرمنی نے ہالینڈ پر قبضہ کر لیا تو دوسرے لوگوں کے ساتھ محترم مرزا ولی احمد بیگ صاحب بھی جنگی قیدی بنا لئے گئے۔ جنگ کے دوران تقریباً" ۶ سال تک جرمنی کی قید میں رہے۔ ریڈیو سے جرمن حکومت زبردستی ان سے ہندوستانیوں کو انگریزوں کے خلاف بغاوت پر اکسانے کا کام لیتے رہے۔ ۱۹۴۵ء میں جرمنی کی شکست کے بعد امریکیوں اور بعد میں انگریزی فوجوں کی قید میں رہے۔ تمام ہندوستانیوں کو پہلے لندن بھیجنے کا پروگرام بنا۔ عام قیدیوں کو لندن میں قیام یا واپس ہندوستان جانے کی اجازت دے دی گئی۔ ان لوگوں سے ہمدردی کے طور پر ۱۰۰ پونڈ فی کس معاوضہ بھی ادا کرنے کی ہدایت کی گئی۔ لیکن مرزا صاحب کو ان ہردو سہولتوں سے انکار کر دیا گیا چونکہ وہ انگریزوں کے خلاف پراپیگنڈے میں ملوث پائے گئے تھے اس لئے نہ صرف ان کو کسی قسم کا معاوضہ نہ ملا بلکہ ان کو پندرہ دن کے اندر اندر ملک چھوڑنے کا حکم ملا۔

انہوں نے برلن میں اپنے قیام کو لمبا کر لیا۔ واپسی کے کاغذات تیار کرنے والی ایک انگریز خاتون سے دوستی کر لی۔ اس سے ایسے کاغذات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جس میں لندن میں قیام کی مدت کا ذکر نہیں تھا۔ اور امداد کی مخصوص مہر بھی لگوالی۔

۱۹۴۶ء میں برلن سے لندن آئے۔ ایک دوست کے ہاں قیام کیا۔ ایک کالج میں ۶ ماہ تک لیکچرار کی ملازمت حاصل کر لی۔ ۶ ماہ بعد ایک دن ہندوستانی سفارتخانے گئے اور سفیر سے ملاقات کی۔ اس نے ان کو بتایا کہ پولیس آپ کو تلاش کر رہی ہے۔ آپ کو تو ۱۵ دن کے اندر اندر واپس جانا تھا۔ پولیس کو بلایا گیا۔ محترم مرزا صاحب نے اپنے کاغذات دکھائے جس میں رہائش کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ پولیس کاغذات دیکھ کر حیران رہ گئی اور ان کو گرفتار نہ کر سکی۔ چند ماہ بعد دوبارہ سفیر سے ملکر امداد کی رقم کا مطالبہ کیا۔ پہلے تو وہ راضی نہ ہوا لیکن پھر اس شرط پر آمادہ ہوا کہ سفارت خانے کا کوئی آدمی آپ کی سفارش کر دے۔ تو امداد مل سکتی ہے۔ اس وقت چوہدری ظفر اللہ خاں صاحب وہیں موجود تھے۔ آپ ان سے ملے۔ تو انہوں نے بھرپور سفارش کر دی۔ کہ یہ صاحب اپنی مرضی سے نہیں بلکہ جرمنوں کے دباؤ کے تحت کام کرتے رہے ہیں اس لئے ان کو زیادہ امداد ملنی چاہئے۔

۱۰۰ پونڈ کی بجائے ۱۵۰ پونڈ امداد کی سفارش کردی جو انہوں نے وصول کرلی۔

۱۹۴۸ء کے آخر میں پونا ممبئی پہنچ گئے۔ وہاں ٹیوشن کا کام شروع کر دیا۔ چند ماہ علیگڑھ بھی قیام کیا۔ جہاں تہذیبی شعبہ (کلچرل ڈیپارٹمنٹ) سے وابستہ رہے۔ ۱۹۴۹ء کے آخر میں دہلی اور وہاں سے لاہور چلے آئے۔ ۱۹۵۱ء کے ابتدائی مہینوں میں کراچی پہنچ گئے۔ حکومت پاکستان نے کالجز میں اسلامیات کی تعلیم لازمی قرار دی تو کراچی صدر کے ایک مشنری کالج میں حکومت کے ہدایات کے مطابق اسلامیات پڑھانے کے لئے مرزا صاحب کی خدمات حاصل کرلی گئیں۔ لیکن کلاس کالج کی بجائے مرزا صاحب کی جائے رہائش پر ہوتی۔ سلسلہ کچھ دیر تک چلتا رہا۔

فروری ۱۹۷۲ء میں اپنی وفات تک کراچی میں بلامعاوضہ انجمن کے نمائندہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ درس و تدریس اور ٹیوشن کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ جمعہ کی نماز کی امامت اور دیگر جماعتی سرگرمیوں میں کراچی جماعت کی راہ نمائی کرتے رہے۔ انہوں نے بڑی اچھی اور فعال زندگی گزاری۔ قناعت پسند' مہمان نواز اور کھلے دل کے مالک تھے۔ کراچی میں زندگی کے آخری ۲۱ سال جماعت کے پہلے مرکز واقع گارڈن روڈ ایسٹ (احمدیہ لائبریری) میں رہائش پذیر رہے۔ فروری ۱۹۷۲ء میں تقریباً" ۱۰۰ سال کی عمر میں مختصر سی علالت کے بعد وفات پائی۔ P.E.C.H. SOCIETY کراچی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ اناللہ و انا الیہ راجعون۔

محترم مرزا ولی احمد بیگ صاحب کی زندگی کے حالات کے سلسلہ میں دو باتوں کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ محترم مرزا صاحب کے انڈونیشیا میں شاگردوں کی کافی تعداد تھی۔ ملک کی نمایاں سماجی اور سیاسی شخصیات میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان میں ایک جنگ آزادی کے ہیرو اور ملک کے پہلے صدر سوئیکارنو بھی تھے اس سلسلہ میں دو واقعات کی روایت ہم تک پہنچی ہے جو انہی کے حوالے سے درج کی جا رہی ہے۔

۱۔ پہلے واقعہ کے راوی محترم شیخ میاں فضل احمد صاحب ہیں۔ جب وہ اپنے انڈونیشیا کے حالیہ دورے پر تشریف لے گئے۔ تو ان کو وہاں سے پتہ چلا کہ جب انگلستان سے واپسی پر محترم مرزا صاحب دہلی میں پاکستان آنے کے لئے کوشش کر رہے تھے لیکن کوئی ان کی شنوائی نہ ہو رہی تھی تو ایک دن ان کو پتہ چلا کہ صدر سوئیکارنو صاحب بھارت کے سرکاری دورے پر آئے ہوئے ہیں۔ اور جمعہ کی نماز جامع مسجد دہلی میں ادا کریں گے۔ مرزا صاحب مسجد پہنچ گئے۔ جب صدر صاحب سیڑھیاں چڑھ کر اندر داخل ہونے لگے تو وہ جلدی سے مجمع سے نکل کر صدر صاحب کے قریب پہنچ گئے۔ پہرے داروں کی نظر پڑنے سے پیشتر ہی مرزا صاحب اور صدر سوئیکارنو بغلگیر ہو چکے تھے۔ اور پروٹوکول کی پرواہ کئے بغیر صدر سوئیکارنو محترم مرزا صاحب کو اپنے ساتھ نماز کے لئے اندر لے گئے۔ اس ملاقات کا اثر یہ ہوا کہ اگلے دن جب آپ سفارت خانے گئے تو سب لوگ آپ کا کام اٹھ اٹھ کر کرنے لگے۔ اور لاہور جانے کی اجازت بلا حیل و حجت مل گئی۔

دوسرے واقعہ کا تعلق بھی صدر سوئیکارنو صاحب سے ہے۔ صدر موصوف جب پہلی مرتبہ پاکستان کے دورے پر آئے تو انہوں نے صدر ایوب سے ہوائی اڈے پر ہی کہا کہ میرے استاد محترم کہاں ہیں۔ پہلے تو صدر ایوب حیران ہوئے لیکن فورا" ہی کہا کہ وہ قصر صدارت میں آپ سے ملاقات کریں گے۔ کیونکہ وہ بوڑھے ہیں یہاں نہیں آسکتے تھے۔ پھر ان سے ذرا الگ ہو کر سیکرٹری کو اس سلسلہ میں ہدایت دی۔ اس نے انڈونیشی سفیر کے ذریعہ محترم مرزا صاحب کا پتہ لگایا اور صدر سوئیکارنو کے قصر صدارت پہنچنے تک مرزا صاحب وہاں پہنچ چکے تھے۔

صدر سوئیکارنو سے ملاقات کے بعد صدر ایوب نے دوبارہ محترم مرزا صاحب کو بلوایا۔ گفتگو کے دوران پتہ چلا کہ محترم مرزا صاحب بہت سی زبانوں کے ماہر ہیں۔ اور ۴ ماہ میں زبانیں سکھا سکتے ہیں۔ اس پر فوجی افسروں کو مختلف زبانیں سیکھنے کیلئے مرزا صاحب کی شاگردی میں دے دیا گیا۔ آج بھی انڈونیشیا میں محترم مرزا ولی احمد بیگ صاحب کا نام نہایت عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ اور انڈونیشیا میں تحریک احمدیت کے لئے ان کی بے لوث خدمات کو خراج تحسین پیش کیا جاتا ہے۔

مرتبہ: ڈاکٹر زاہد عزیز، ایڈیٹر ماہنامہ لائٹ

احمدیہ انجمن اشاعت اسلام امریکہ کی ویب سائٹ پر چند سوالات اور ان کے جوابات

جماعت کا نام "احمدیہ" رکھنے کے بارے میں سوال

ہم ذیل میں کچھ سوالات درج کرتے ہیں جو ہماری ویب سائٹ پر بذریعہ ای میل وصول ہوئے اور ان کے ذیل کے جوابات دیئے گئے۔

"میں امریکہ میں ایک طالب علم ہوں۔ میں نے کافی عرصہ سے چند مطبوعات (کتابوں، پمفلٹوں، اور ہاں افواہوں) کے زیر اثر یہ فرض کر رکھا تھا کہ "قادیانی" یا "احمدی" مسلمان نہیں ہوتے۔ اس بارے میں بڑی دلیل حضرت میرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٰ ثبوت تھا۔ مگر جب میں احمدیہ ویب سائٹ (WWWO MUSLIM ORG) پر گیا' تو مجھے احساس ہوا (جتنا کہ میں اب تک پڑھ سکا ہوں اور اندازہ لگا سکا ہوں) کہ اس مسئلہ میں کوئی ایسی بات نہیں جو کہ کسی "قادیانی" یا "احمدی" کے ایک سچا مسلمان کا درجہ حاصل کرنے میں روک ہو۔

"آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ آپ کو اپنے گروپ کو بطور "قادیانی / احمدیہ موومنٹ" ممیز کرنے کی کیا پڑی ہے' آپ اپنے آپ کو فقط "مسلمان" کیوں نہیں کہتے؟ اس کے جواب سے مجھے بڑی مدد ملے گی!

مندرجہ بالا سوال کا جواب

سب سے پہلے تو ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے ہمیں اپنا مسلمان بھائی گردانا۔ اس قسم کی رواداری بدقسمتی سے زیادہ عام نہیں ہے۔

آپ کے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ احمدیہ موومنٹ کی بنیاد ایک خاص مقصد کیلئے رکھی گئی تھی یعنی کہ اسلام کو اس کے صحیح رنگ میں دنیا تک پہنچانا اور کچھ ایسی غلط فہمیاں اسلام کے بارہ میں دور کرنا جو کہ ماضی میں بھی اور اب بھی دنیا میں اسلام کے نام کو تشویشناک ضرر پہنچا رہی ہیں۔ آیت نمبر ۳:۱۰۴ کے ذریعہ قرآن شریف مسلمانوں سے تقاضا کرتا ہے کہ ان میں سے ایک گروہ ایسا ہو جو کہ تبلیغ کے کام کیلئے وقف ہو۔ اور اسی آیت کے احکامات کے تحت احمدیہ موومنٹ کی بنیاد رکھی گئی۔

کسی خاص مقصد کیلئے مسلمانوں کو ایک علیحدہ گروپ یا جماعت بنانے کی اجازت ہے مسلمانوں میں کئی ایسے گروپ ہیں مثلاً" جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت "اسلامی جہاد" اور اس قسم کے سینکڑوں اور بھی ہیں۔ مگر ہم کبھی ان جماعتوں کے علیحدہ وجود یا علیحدہ ناموں کے بارے میں کوئی اعتراض نہیں سنتے!

نام "احمدیہ" کا تعلق حضور نبی کریم صلعم کے دوسرے نام "احمد" کے ساتھ ہے اور یہ نام اس تحریک کو اس لئے دیا گیا ہے کہ "احمد" کے نام حضور صلعم کے جمالی اور پرامن دور کا مظہر ہے۔ جس دور میں کہ اسلام دشمنوں کی ایذا رسان مخالفت کا مقابلہ کرتے ہوئے صبر وعظ و نصیحت کے ذریعہ پھیلا جب کہ اسے کوئی دنیاوی حکومت حاصل نہ تھی (یہ دور بعد کے اس دور سے علیحدہ ہے جب کہ اسلام کو لڑائیاں لڑنی پڑیں اور سیاسی اقتدار حاصل ہوا) چونکہ ہم یقین رکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں اسلام کا پھیلاؤ حضور صلعم کی زندگی کے "احمدی" دور کی طرز پر ہو گا۔ اسی لئے اس تحریک کا یہ نام رکھا گیا۔

لاریب کچھ مسلمان ہم سے اختلاف رکھتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ اسلام صرف سیاسی قوتوں کے ذریعہ ہی پھیل سکتا ہے۔ سو ہمارا نام ہماری اس نقطہ نظر اور رویئے کا مظہر ہے۔

دوسرا سوال اور اس کا جواب

کیا آپ کے اور دوسرے "غیر قادیانی" یا "غیر احمدی" مسلمانوں میں کوئی فرق ہے؟

جواب :۔ اسلام کی تفسیر و توضیح کے حوالہ سے کئی مسائل ایسے ہیں جو موجودہ زمانہ میں اسلام کیلئے نازک مضمرات کے حامل ہیں۔ جن میں ہم یقین رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا عام عقیدہ قرآن اور نبی کریم کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اس بارے میں آپ کی توجہ ہمارے "ہوم ویب پیج" Home Web Page کی طرف مبذول کراتا ہوں جس میں ان تمام مسائل کی نشان دہی کی گئی ہے۔

مثلاً" مسلمانوں علماء کا جہاد اور مذہبی آزادی کے بارے میں غلط نظریہ اسلام کو ایک زبردستی والا جبریہ اور غیر روادار مذہب کا تاثر دیتا ہے۔ ہماری تحریک ان غلطیوں کا ازالہ کرتی ہے اور اسلام کو بطور ایک معتدل، پرامن اور روادار مذہب پیش کرتی ہے۔

تیسرا سوال اور اس کا جواب

"قرآن کریم میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم فرقوں اور گروہوں میں نہ بٹیں۔ تو پھر آپ اپنی تحریک کو ایک نیا نام دے کر ایک اور نام کا اضافہ کیوں کرتے ہیں؟ اس طریق پر آپ کا چھوٹا سا گروپ باقی مسلمان ملت سے الگ ہو کر رہ جاتا ہے۔ بلکہ ایک جیسے عقائد میں بھی!

جواب :۔ "احمدیہ تحریک حقیقت میں کوئی فرقہ نہیں۔ ایک فرقہ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ دوسروں کے ساتھ کوئی اعتقادی فرق ہو۔ ہماری تحریک کا بڑا مقصد یہ ہے کہ اسلام کو اس کی اصلی اور سچی شکل میں دنیا تک پہنچائے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے کہ قرآن مجید اور سنت نبویؐ کو بنیاد بنا کر ہماری "مخصوص" تشریحیں اس کام کو موثر طریقہ پر انجام دینے کیلئے اسلحہ فراہم کرتی ہیں اور اسلام پر ایمان کو مستحکم کرتی ہیں۔

اسلام میں فرقے، بشمولیت باہمی مفاہمت کے ہماری تحریک کے وجود میں آنے سے پہلے موجود تھے۔ ہمیں اسلام میں فرقہ بازی متعارف کرانے کے الزام سے متہم نہیں کیا جا سکتا۔

مختلف نام مثلاً" سنی، وہابی، دیوبندی اور بہت سے اور بھی ہمارے وجود میں آنے سے بہت پہلے سے موجود تھے۔ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ "اس طریق پر آپ باقی مسلمان کمیونٹی سے علیحدہ ہو جاتے ہیں" تو یاد رکھیں کہ ملت اسلامی تو پہلے سے ہی تقسیم شدہ تھی۔ انہی ابتدائی فرقوں نے "فرقہ بندی" کو فروغ دیا۔ مگر ان سے کوئی نہیں پوچھتا کہ وہ اپنے آپ کو سنی یا شیعہ کیوں کہتے ہیں اور فقط مسلم کیوں نہیں کہتے! اب میں تصویر کے مثبت رخ کی طرف آتا ہوں احمدیہ تحریک اسلام میں فرقہ بندی کو ختم کرنا چاہتی ہے ہماری تحریک کی تعلیم ہے کہ تمام وہ لوگ جو کلمہ گو ہیں انہیں مسلمان سمجھنا چاہئے اور ان سے مسلمان بھائیوں والا سلوک کرنا چاہئے۔ اگر اس اصول کو اپنا لیا جائے تو تمام فرقہ وارانہ منافرت ختم ہو جائے گی۔ مسئلہ مختلف فرقوں کا وجود یا ان کے نظریات کا اختلاف نہیں، بلکہ فقط ایک دوسرے سے مخاصمت ہے جو کہ ایک لعنت کی طرح ملی اتحاد کو پارہ پارہ کئے ہوئے ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ : کیپٹن عبدالسلام)